رامش و رنگ

جوش ملیح آبادی

ناشر
قومی دار الاشاعت ممبئی
۱۹۴۵ء

قیمت چھ روپیہ آٹھ آنہ

پھر تیشۂ نو ہوا ہے وادی میں بلند
پھر جوشش دھڑک رہا ہے کہسار کا دل

نظمیں

ایک طویل نظم

سنکی وہ ہوائے نو خدارا جاگو
چمکی وہ فضا پہ ضَو خدارا جاگو
وہ کانپ رہا ہے دودِ شمعِ سحری
وہ پھوٹ رہی ہے پو خدارا جاگو

کلیاں چونکی ہیں مُسکراؤ تم بھی
شاخوں میں لچک ہے، سرسراؤ تم بھی
ہاں باندھ رہی ہے رات جوڑا اپنا
ماتھے سے خُنک لٹیں ہٹاؤ تم بھی

اِترائی ہوئی ہے تازہ پھولوں کی مہک
سبزے میں ہے اضطراب، پودوں میں لچک
یہ گھر سے چلا ہے کون گلشن کی طرف؟
خوشوں میں فتادگی ہے کلیوں میں ہُمک

۷

پُرشور ہے پھر رہروِ بیدار کا دل
لرزش میں ہے پھر کوچہ و بازار کا دل
پھر تیشۂ نوحہ ہوا ہے وادی میں بلند
پھر جوشِ دھڑک رہا ہے کہسار کا دل

قندیلِ شب افروز کی لَو راہ میں ہے
خورشیدِ سحر تاب کی ضو راہ میں ہے
پھر خاک کے دل میں بج رہے ہیں ناقوس
شاید صنمِ حیاتِ نو راہ میں ہے

۱۹۴۵ء

اُٹھ اَے ندیم!

اُٹھ اے ندیم، کہ رنگِ جہاں بدل ڈالیں
زمیں کو تازہ کریں، آسماں بدل ڈالیں

ہر اک لحاظ سے پکوان اِس کا پھیکا ہے
بہ پاسِ ذوق یہ اُونچی دُکاں بدل ڈالیں

عُروجِ نوعِ بشر کو فلک سے ٹکرا کر
خیالِ رفعتِ کرّ وبیاں بدل ڈالیں

غم و خوشی کو مُرتّب کریں بہ طرزِ جدید
بہ شکلِ خندہ، یہ طرزِ فُغاں بدل ڈالیں

بہت ہی تنگ ہے یہ جامہ ذہن و معنیٰ پر
یہ سُست لہجہ یہ سطحی زباں بدل ڈالیں

جو زنگ خُوردہ ہے مُدّت سے اور جو بے جان
وہ کُہنہ تیر، وہ ٹوٹی کماں بدل ڈالیں

تخیّلاتِ اضافی کی رہنُمائی میں
تعیُّناتِ زمان و مکاں بدل ڈالیں

تعصُّباتِ گُل و خار کو فنا کر کے
توہُّماتِ بہار و خزاں بدل ڈالیں

نظامِ وحدتِ اقوام کا ہے یہ منشور
کہ یہ تصوّرِ سُود و زیاں بدل ڈالیں

لباسِ کہنہ، جواں عصر پر نہیں پھبتا
لباسِ کہنۂ عصرِ جواں بدل ڈالیں

تمام جُبن و تجارت ہے مقصدِ اخلاق
یہ خوفِ نار، یہ شوقِ جناں بدل ڈالیں

جدید ذوقِ تجسّس کا حُکم ناطق ہے
کہ یہ تخیّلِ ربِّ جہاں بدل ڈالیں

قدیم وہم نے جس کو یقین سمجھا تھا
نئے یقین سے اب وہ گُماں بدل ڈالیں

۱۱

برائے کوکبۂ فکرِ تازۂ انساں
یہ کہنہ طبل و علم، یہ نشاں بدل ڈالیں
بس اک فریب ہے، یہ قوس توڑ دیں آؤ
بس اک غبار ہے، یہ کہکشاں بدل ڈالیں
نظامِ کہنہ پرہیز و رسمِ تقویٰ کو
بحکمِ حضرتِ پیرِ مغاں بدل ڈالیں
اُٹھ اے رفیق! کہ اِس عالمِ سبک سر کو
بہ نیم جنبشِ رطلِ گراں بدل ڈالیں
یہ ولولہ ہے تو آ سب سے پیشتر اے دوست
مزاجِ طفلکِ ہندوستاں بدل ڈالیں

۱۹۴۵ء

اپنی ملکۂ سخن سے

(اعترافِ احساں)

اے شمعِ جوشِ و مشعلِ ایوانِ آرزو
اے مہرِ ناز و ماہِ شبستانِ آرزو
اے جانِ دردمندی وایمانِ آرزو
اے شمعِ طور و یوسفِ کنعانِ آرزو

ذرّے کو آفتاب، تو کانٹے کو پھول کر
اے روحِ شعر سجدۂ شاعر قبول کر

دریا کا موڑ، نغمۂ شیریں کا زیر و بم
چادر شبِ نجوم کی، شبنم کا رختِ نم
تتلی کا نازِ رقص، غزالہ کا حُسنِ رم
موتی کی آب، گُل کی مہک، ماہِ نَو کا خم

اِن سب کے اِمتزاج سے پیدا ہوئی ہے تُو
کتنے حسین اُفق سے ہویدا ہوئی ہے تُو

ہوتا ہے مہ وشوں کا وہ عالم ترے حضور
جیسے چراغِ مُردہ، سرِ بزمِ شمعِ طُور
آ کر تری جناب میں اے کارسازِ نُور
پلکوں میں مُنھ چھپاتے ہیں جھینپے ہُوئے غرور

آتی ہے ایک لہر سی چہروں پر آہ کی
آنکھوں میں چھُوٹ جاتی ہیں نبضیں نگاہ کی

رفتار ہے کہ چاندنی راتوں میں موجِ گنگ
یا بھیرویں کی پچھلے پہر قلب میں اُمنگ
یہ کاکلوں کی تاب ہے، یہ عارضوں کا رنگ
جس طرح جُھٹ پٹے میں شب و روز کی ترنگ

•

رُوئے مُبیں، نہ گیسُوئے سَنبُل قِوام ہے
وہ برہمن کی صُبح، یہ ساقی کی شام ہے

آواز میں یہ رَس، یہ لطافت، یہ اِضطرار
جیسے سُبک، مہین، رواں، ریشمی پھُوار
لہجے میں یہ کھٹک ہے کہ ہے نیشتر کی دھار
اور گر رہا ہے دھار سے شبنم کا آبشار

چہکی جو تُو چمن میں، ہوائیں مہک گئیں
گُل برگِ تر سے اوس کی بوندیں ٹپک گئیں

جادو ہے تیری صوت کا گل پر، ہزار پر
جیسے نسیمِ صبح کی رو جُوئبار پر
ناخن کسی نگار کا چاندی کے تار پر
مِضرابِ عکسِ قوس رگِ آبشار پر

مَوجیں صَبا کی باغ پہ صہبا چھڑک گئیں
جُنبش ہُوئی لبوں کو تو کلیاں چٹک گئیں

چشمِ سیاہ میں وہ تلاطم ہے نُور کا
جیسے شرابِ ناب میں جوہر سُرور کا
یا چہچہوں کے وقت تموّج طیُور کا
باندھے ہُوئے نشانہ کوئی جیسے دُور کا

ہر موجِ رنگِ قامتِ گل ریز رَم میں ہے
گویا شرابِ تُند، بلُوریں قلم میں ہے

تجھ سے نظر ملائے، یہ کس کی بھلا مجال
تیرے قدم کا نقش، حسینوں کے خدّ و خال
اللہ رے تیرے حُسنِ مَلک سُوز کا جلال
جب دیکھتی ہیں خُلد سے حُوریں ترا جمال

پرتو سے تیرے چہرۂ پروین سرشت کے
گھبرا کے بند کرتی ہیں غُرفے بہشت کے

چہرے کو رنگ و نور کا طوفاں کئے ہوئے
شمع و شراب و شعر کا عنواں کئے ہوئے
ہر نقشِ پا کو تاجِ گلستاں کئے ہوئے
سو طور اک نگاہ میں پنہاں کئے ہوئے

آتی ہے تو چمن میں جب اِس طرز و طور سے
گُل دیکھتے ہیں باغ میں بلبل کو غور سے

میرے بیاں میں سحر بیانی تجھی سے ہے

رُوئے سُخن پہ خُونِ جوانی تجھی سے ہے

لفظوں میں رقص و رنگ و روانی تجھی سے ہے

فقرِ گدا میں فرِّ کیانی تجھی سے ہے

فدوی کے اس عُروج پہ کرتی ہے غور کیا

تیری ہی جُوتیوں کا تصدُّق ہے اور کیا

اے گردگارِ معنیٰ و خلّاقِ شعرِ تر
اے جانِ ذوق و محسنۂ لیلیٰ ہنر
کھل جائے گر یہ بات کہ اردو زبان پر
تیری نگاہِ ناز کا احساں ہے کس قدر

چاروں طرف سے نعرۂ صلّ علیٰ اُٹھے
تیرے مجسّموں سے زمیں جگمگا اُٹھے

میرے ہنر میں صرف ہوئی ہے تری نظر
خیمہ ہے میرے نام کا بالائے بحر و بر
شہرت کی بزم تجھ سے منوّر نہیں مگر
فرقِ گدا پہ تاج ہے، سُلطاں برہنہ سر

پروانے کو، وہ کون ہے جو مانتا نہیں
اور شمع کس طرف ہے کوئی جانتا نہیں

دل تیری بزمِ ناز میں جب سے ہے باریاب
ہر خار ایک گُل ہے تو ہر ذرّہ آفتاب
اک لشکرِ نشاط ہے ہر غم کے ہم رکاب
زیرِ نگیں ہے عالمِ تسکین و اضطراب

یادِ مُراد و چشمکِ طوفاں لئے ہوئے
ہوں بُوئے زُلف و جُنبشِ مژگاں لئے ہوئے

تیرے لبوں سے، چشمۂ حیواں مرا کلام
تیری لٹوں سے موجۂ طوفاں مرا کلام
تیری نظر سے طور بداماں مرا کلام
تیرے سخن سے نغمۂ یزداں مرا کلام

تُو ہے پیامِ عالمِ بالا مرے لئے
اک وحیٔ ذی حیات ہے گویا مرے لئے

اے ماہِ شعر پرور و مہرِ سخن وری
اے آب و رنگِ حافظ و اے حسنِ انوری
تو نے ہی ثبت کی ہے بصد نازدا وری
میرے سخن کی پشت پہ مہرِ پیمبری

تیری شمیمِ زلف کی دولت لئے ہوئے
میرا نفس ہے بوئے رسالت لئے ہوئے

دُرہائے آب دار و شرر ہائے دل نشیں
شب ہائے تلخ و تُرش و سحر ہائے شکّریں
عقلِ نشاط خیز و جُنونِ غم آفریں
دولت وہ کون ہے جو مری جیب میں نہیں

ٹکرائی جب بھی مجھ سے، خجل سروری ہوئی
یُوں ہے ترے فقیر کی جھولی بھری ہوئی

نغمے پلے ہیں دولتِ گفتار سے تری
پایا ہے نطق، چشمِ سخن بار سے تری
طاقت ہے دل میں نرگسِ بیمار سے تری
کیا کیا ملا ہے جوشؔ کو سرکار سے تری

بانکے خیال ہیں خمِ گردن لئے ہوئے
ہر شعر کی کلائی ہے کنگن لئے ہوئے

اے لیلیٰ نہفتہ واے حُسنِ شرمگیں
تجھ پر نثار دولتِ دُنیا، متاعِ دیں
منسوب مجھ سے ہے جو یہ اندازِ دل نشیں
تیری وہ شاعری ہے، مری شاعری نہیں

آوازہ چرخ پر ہے جو اِس دردمند کا
گویا وہ عکس ہے ترے قدِّ بلند کا

میرے بیاں میں یہ جو وفورِ سُرور ہے
طاقِ سُخن وری میں جو یہ شمعِ طُور ہے
یہ جو مرے چراغ کی ضَو دُور دُور ہے
سرکار ہی کی مَوجِ تبسُّم کا نور ہے

شعروں میں کروٹیں یہ نہیں سوز و ساز کی
لہریں ہیں یہ حُضور کی زُلفِ دَراز کی

مجھ رندِ حُسن کار کی مے خواریاں نہ پُوچھ
اِس خوابِ جاں فُروز کی بیداریاں نہ پُوچھ
کرتی ہے کیوں شرابِ خرد باریاں نہ پُوچھ
بے ہوشیوں میں کیوں ہیں یہ ہُشیاریاں نہ پُوچھ

پیتا ہُوں وہ، جو زُلف کی رنگیں گھٹاؤں میں
کھنچتی ہے اِن گھنی ہوئی پلکوں کی چھاؤں میں

ہُشیار اس لئے ہُوں کہ مے خوار ہُوں ترا
صیّادِ شعر ہُوں کہ گرفتار ہُوں ترا
لہجہ مَلیح ہے کہ نمک خوار ہُوں ترا
صحّت زبان میں ہے کہ بیمار ہُوں ترا

تیرے کرم سے شعر و ادب کا امام ہُوں
شاہوں پہ خندہ زن ہُوں کہ تیرا غُلام ہُوں

۔۔ ۔ ۔ ۔ بں کے غم نے ترے دل میں راہ کی
اک عُمر جس کے عشق میں خود تُو نے آہ کی

سویا ہے شوق سیج پہ تیری نگاہ کی
راتیں کٹی ہیں سائے میں چشمِ سیاہ کی

کیونکر نہ شاخِ گُل کی لچک ہو بیان میں
تیری کمر کا لوچ ہے میری زبان میں

ترشے ہوئے لبوں کے بہکتے خطاب سے
زرتار کاکلوں کے مہکتے سحاب سے
سرشار انکھڑیوں کے دہکتے شباب سے
موجِ نفس کے عطر سے، مکھڑے کی آب سے

بارہ برس تپا کے زمانہ سہاگ کا
سینچا ہے تو نے باغ مرے دل کی آگ کا

گرمی سے جس کی برف کا دیوتا ڈرے، وہ آگ
شعلوں میں اوس کو جو مُبدّل کرے، وہ آگ
لُو سے جو زمہریر کا دامن بھرے، وہ آگ
حد ہے، جو نام نارِ سقر پہ دھرے، وہ آگ

جس کی لپٹ گلے میں جلاتی ہے راگ کو
پالا ہے قلبِ ناز میں تُو نے اُس آگ کو

سنہ ۱۹۴۴ء

ایک تصویر کو دیکھکر

تمکنت، خلوت، جوانی قصر، مسند، پیچوان،
قلب میں نقشِ تصوّر، انکھڑیوں میں داستان
سامنے تلوار، رُخ پر بانکپن کی ایک شان
اے حرم کی روشنی، اللہ ری تیری آن بان

ایک سنّاٹا ہے بزمِ عالمِ ایجاد میں
نوجوانی غرق ہے شاید کسی کی یاد میں

دو رنگی

دُھومیں مچی ہوئی ہیں برسات کی ہوائیں
دوڑی ہوئی ہیں کیا کیا جولانیاں فضائیں
رنگینیاں گلوں پر، اٹکھیلیاں صبا میں
گھنگھور، گنگناتی، گاتی ہوئی گھٹائیں

لیلائے زندگی کی زلفیں سنور رہی ہیں
اور راستے سے کتنی لاشیں گزر رہی ہیں

میلا جما ہوا ہے، پکوان پک رہے ہیں
باجوں کے غلغلوں میں گھوڑے بھڑک رہے ہیں
بوڑھے چہک رہے ہیں، بچے پھدک رہے ہیں
جھولوں کی گردشوں میں چہرے دمک رہے ہیں

میداں میں آسماں سے حوریں اتر رہی ہیں
اور راستے سے کتنی لاشیں گزر رہی ہیں

چاندی کی بہہ رہے ہیں فرشِ زمیں پہ دھارے
کلیوں پہ ہے تبسّم، خنداں ہیں پھول سارے
حیرت سے تک رہے ہیں پچھلے پہر کے تارے
دھومیں مچی ہوئی ہیں، "آئے سجن ہمارے"

گھر والیاں زچہ کی یوں گود بھر رہی ہیں
اور راستے سے کتنی لاشیں گزر رہی ہیں

بدمست و بے خمار و بیدار محفلوں میں
سرمست و سرشباب و سرشار محفلوں میں
زرسبز و زرفشاں و زرکار محفلوں میں
گل ریز و گل چکان و گل بار محفلوں میں

راگوں کے غلغلوں سے راتیں نکھر رہی ہیں
اور راستے سے کتنی لاشیں گزر رہی ہیں

اشنان کر چکے ہیں خُوبانِ آئینہ رُو
آنکھوں میں ہنس رہا ہے پہلی کرن کا جادُو
مانگیں نکل رہی ہیں، بَل کھا رہی ہے خوشبو
مُکھڑوں سے ہٹ رہے ہیں عنبر فروش گیسو

شاموں کی سرزمیں سے صُبحیں اُبھر رہی ہیں
اور راستے سے کتنی لاشیں گزر رہی ہیں

۱۹۴۴ء

آسماں زمزمہ بر لب ہے، زمیں چنگ بدوش

آج پھر بزمِ حریفاں میں ہے اک طرفہ خروش

سینۂ شوق میں ہے برقِ شباب و مستی

جامِ سرشار میں ہے بادۂ تند و سرجوش

آج پھر ہے اثرِ لحن و فسونِ قلقل

برتر از نغمۂ زہرا و بہ از بانگِ سروش

اُس طرف رطلِ گراں ہے تو ادھر حُسن جواب
وہ ہے آغوشِ شراب، اور یہ شرابِ آغوش

آتشِ لالہ و گُل، آبِ لطیفِ شبنم
آج اِن اضداد کی موجیں ہیں رواں دوش بدوش

صُبحِ کہسار ہے ہر مُطربۂ زُہرہ جبیں
شبِ مہتاب ہے ہر مُغبچہ بادہ فروش

دیر سے گونج رہی ہے یہ حکیمانہ صدا
اے برادر، غمِ ایّام مخور، بادہ بنوش

دولتِ ہر دو جہاں نیست بقدرِ یک جام
آفریں باد برایں نعرۂ مستانہ جوش

۱۹۴۱ء

چند لڑکوں نے صحنِ باغ میں کل
رکھ دیا اک تماشتی بنڈل
ایک صاحب اُدھر سے جب گزرے
ٹھٹکے، جھجکے، تھمے، بڑھے، لپکے
رُک کے پہلے اِدھر اُدھر دیکھا
اور کوئی جب نظر نہیں آیا
دل کی جھپکر پہ آگئی ہلچل
ہات کانپے، اُٹھالیا بنڈل

اتنے میں قہقہا آ مارِ د کا

باغ کے صحن میں بلند ہُوا

قہقہوں کی صدائیں سُنتے ہی

دفعتۃً رُخ پہ چھا گئی زردی

زور سے پھینک کر وہیں بنڈل

ہات میں لے کے پاؤں سے چپّل

وضعداری کے توڑ کر تاگے

تیز خرگوش کی طرح بھاگے

وہ جو یوں بستہ گریز ہوئے

قہقہے سب کے اور تیز ہوئے

اور یہاں اشک ڈبڈبا آئے
ہو گئے تیرہ باغ کے سائے
جبرِ ترغیب و امرِ زنجوری
وائے نوعِ بشر کی مجبوری!
کوئی حد ہی نہیں ہے پستی کی
یہ غلامی و تنگ دستی کی

۱۹۴۱ء

جاتا ہوں کوئے یار سے

جاتا ہوں کوئے یار سے حسرت لئے ہوئے
سینے میں درد و جنبش و رقّت لئے ہوئے

بادل ہیں بارِ غم کی صعوبت سے بیقرار
جھونکے ہیں سوزِ غم کی حرارت لئے ہوئے

ہر پیچ و خم ہے وادیٔ مینو سواد کا
سامانِ صد ہزار جراحت لئے ہوئے

لیلائے ہست و بود ہے فرطِ ملال سے
نوکِ مژہ پہ گوہرِ حسرت لئے ہوئے

گاڑی کی نے ہے نالہ و شیون سے ہمکنار
جنگل سی شے ہے پرَتوِ کلفت لئے ہوئے

ہر آن میرے سینے سے باہر ہر ایک سانس
آتی ہے میری روح کی طاقت لئے ہوئے

اونچے پہاڑ سوزِ دروں سے دھواں دھواں
کالی گھٹائیں ہجر کی ظلمت لئے ہوئے

ہر بات ہے پیامِ تباہی و بے کسی
ہر سانس ہے وعیدِ ہلاکت لئے ہوئے

پونے سے آٹھ روز کی یہ غیر حاضری
آغوش میں ہے شورِ قیامت لئے ہوئے

کیا عُذر کر سکوں گا شریکِ حیات سے
ہُوں دوشِ اضطراب پہ دہشت لیے ہوئے

۱۹۴۴ء

لطفِ غبار

ہاں مرے دل میں غبار اُس سے ہے لیکن اس طرح
آئینہ خانے میں جیسے دُودِ پیچاں عُود کا
یا سحر کو جلوۂ شبنم پہ کُہرے کی ردا
عکس یا آبِ رواں میں صبحِ ابر آلُود کا

۱۹۴۴ء

پرتوِ اجسام

ساقی وہ کھلے پھول، اُڑا کاگ، اُٹھا جام
چٹکا ہے بہ فرمانِ طرب غنچۂ ایّام
صد شکر کہ پھر آج ہے وابستۂ آغوش
محبوبۂ گل چہرہ و معشوقۂ گل فام
یک جا ہیں پھر اک بارِ مشیّت کے علی الرّغم
یارانِ رواں بخش و نگارانِ دل آرام

پھر مسندِ زرّیں پہ ہیں رقصان و غزلخواں
ترکانِ خُنک چہرہ و خوبانِ گُل اندام

رنگین کھجوروں سے اُبھرتا ہوا مہتاب
مہتاب میں رخشندگی وجہِ ذُوالاکرام

اِس فرش کی محراب میں یہ عرش کی قندیل
اِس صُبحِ بد آغاز کی یہ شام خوش انجام

پھر گنبدِ اجسام میں ہے نغمۂ ارواح
پھر عالمِ ارواح پہ ہے پرتوِ اجسام

سرشار گھٹاؤں سے برستی ہے زمیں پر
مے پروریٔ حافظ و بدمستیٔ خیّام

پھر باغ نے کھولا ہے درِ حرف و حکایت

ہر برگ میں اک نامہ ہے ہر پھول میں پیغام

اُس بزم کے ناظم ہیں گدایانِ خرابات

جس بزم میں جبریل ہے منجملۂ خدّام

تم کون ہو جو پاؤں مرے چوم رہے ہو؟

بندے کا قضا اسم ہے، فدوی کا قدر نام

اے جوشؔ مرے کفر کا وہ قصر ہے عالی

جس قصرِ فلک بوس کا اک غرفہ ہے اسلام

۱۹۴۵ء

برسات کا پچھلا پہر

پچھلا پہر، لطیف ہوا، مست سبزہ زار
لچھے سیاہ ابر کے، بالائے کوہسار
چڑیوں کی گونج، نہر کا خم، مور کی پکار
ہلکی، سُبک، مہین، رواں، شبنمی پھوار

اور شبنمی پھوار سے ٹھنڈی ہوا کی چھیڑ
برسات کی دُلائی سے بادِ صبا کی چھیڑ

گردوں قرابہ نوش، تو گیتی ہے مے پرست
رنگینیوں میں غرق ہے دُنیائے بُود و ہست
اوڑھے ہے اک حباب سی چادر بلند و پست
سبزہ غنودہ، پھول زنندا، سے ہوائیں مست

کہسار کی کمر ہے گھٹا سے کسی ہوئی
گل گوں فضا پہ خواب کی بستی بسی ہوئی

ہلکا سا نُور بیچ میں، ظُلمت اِدھر اُدھر
کچھ شام کا نمک ہے، تو کچھ صُبح کی شکر
رہ رہ کے کروٹیں سی شگوفوں کے رنگ پر
اور اس قدر لطیف کہ جمتی نہیں نظر

کہرے کا رنگ رُوئے فضا پر پھرا ہُوا
ابرِ سفوفِ شبنم و گُل ہے گھرا ہُوا

۱۹۴۴ء

طوفان بن

اے طائرِ لب بستہ، آ، مرغِ خوش الحان بن
یہ مُردہ دِلی تا کے؟ اُٹھ، جانِ گلستاں بن

تقلید کے دیوانے، تقلید گدائی ہے
تحقیق ہے سُلطانی، ہم پایۂ سلطاں بن

اے پیرئ افسُردہ، آ، درسِ جوانی لے
اے ملّتِ مفتُوحہ، اُٹھ، فاتحِ دوراں بن

بستر پہ ہے اک دُنیا، بیمار ہے اک عالم
آ، زخم کا مرہم بن، آ درد کا درماں بن

مُنعِم سے ہو رُو گرداں، مُفلِس سے محبت کر
اے شعلۂ بُستاں قندیلِ بیاباں بن
نظّارگیٔ گردوں، گیتی کو بنا مرکز
اے صیدِ الُوہیّت، وابستۂ انساں بن
اے رُوحِ سکُوں خستہ، اے موجۂ یخ بستہ
بڑھتی ہوئی ہلچل بن، بپھرا ہوا طوفاں بن
اے عقل، تدبّر کے سائے میں نظر ہو جا
اے علم، تفکّر کے آغوش میں عرفاں بن

سنہ ۱۹۴۴ء

میں اپنے دنوں کی تابش کو
جب اور بھی تاباں کرتا ہوں
تو ظلمت میری راتوں کی
کچھ اور بھی گَندلا جاتی ہے
اور جب میں اپنی راتوں کو
تابندہ و رخشاں کرتا ہوں
تو میرے دنوں کی گُل تابی
کمھلا اور کجلا جاتی ہے

سنہ ۱۹۴۰ء

مژدہ حریفانِ بزم، آج ہے پھر نغمہ خواں
لرزشِ موجِ صبا، جنبشِ رطلِ گراں
قافلۂ شوق کا رُخ ہے سوئے رقص و رنگ
رحمتِ حق ہم رکاب، فیضِ صبا ہم عناں
چڑھتی ہوئی دُھوپ ہے نشّے کی بالیدگی
اُڑتا ہوا رنگ ہے عقل کا بارِ گراں
باغ کی ہر شاخ ہے رُوکشِ قلبِ رقیق
جام کی ہر موج ہے جنبشِ نبضِ جواں

مست ہے ہلکی پھوار، تیز ہے موجِ ستار
سینۂ آہن میں ہے نغمۂ آبِ رواں
مطربِ شیریں نوا، سازِ جوانی اٹھا
پائے سبو پر جھکا کنگرۂ آسماں
دیدۂ دل باز کر، دیکھ جھلکتے ہوئے
موت کے رخسار پر عمرِ ابد کے نشاں
بزمِ خرابات میں نعرۂ مجذوب ہے
فلسفۂ بوعلی، حکمتِ یونانیاں
بزمِ خرابات میں گونج رہی ہے صدا
پھر ہو دوبارہ قبول سجدۂ کرّوبیاں

بنتِ عنب نے کیا دل کو چمن آشنا
رند سمجھنے لگے برگ و ثمر کی زباں
لرزہ بر اندام ہے کاوشِ دنیا و دیں
مے کی ہر اک بوند ہے حلقۂ دارالاماں
جس کو پلائے گی موت، ساغرِ آبِ حیات
جوشؔ ہے دراصل وہ شاعرِ ہندوستاں

سنہ ۱۹۳۰ء

دَر آمرے گھر میں بھی

دَر آمرے گھر میں بھی کسی شب شرر افشاں

گُل ریزِ چمن بیز و سَمن بار و زَر افشاں

خود تو نے جلائی تھی مرے دل میں جو قندیل

اب یاس کی پُر شور ہوا میں ہے پَر افشاں

بے کَفش و کُلہ کب سے ترے در کا گدا ہے

اے زہرہ وشِ تاج فشان و کمر افشاں

زلفوں میں درازی ہے تو قامت میں بلندی

وہ ابرِ چمن بار یہ شاخِ ثمر افشاں

دل اس نظر و ابروئے خمدار پہ قرباں

وہ تیرِ جگر دوز، یہ شمشیرِ سر افشاں

آجا کبھی اس رندِ خرابات کے گھر میں

با دیدۂ مے بار و بہ لعلِ شکر افشاں

جُھرمٹ میں ستاروں کے فقط ایک شب آجا

چھٹکے ہوئے اس زُلف پرِ سیمبر افشاں

اک عمر سے تاریک ہے محرابِ تمنّا
اے ساحرۂ شمس چکان و قمر افشاں

شامیں بھی مری زِشت ہیں صُبحیں بھی مری زَرد
اے کاکُلِ شب ریز و جبینِ سحر افشاں

میں اور خزف چینیٔ وَذرّات شُماری
فریاد ہے اے لعل فَروش و گُہر افشاں

اُس جوش سے تو بخُل نہ کر اے دہنِ تنگ
جس کا ہے سخن بحر بہ آغوش و بَرافشاں

سنہ ۱۹۴۵ء

کوئی سُن لے نہ کہیں!

اب کہ جب ٹوٹ چکا ہے ستمِ لیل و نہار
میرا دورِ طرب انگیز، مری فصلِ بہار
سایۂ آہ میں ہے زمزمہ خوانی میری
خُفتہ ہے شیب کے زانُو پہ جوانی میری
رُخ ہے اب قافلۂ عُمر کا پستی کی طرف
بُوئے کافور رواں ہے مری ہستی کی طرف

اک روش بھی نہیں باقی ہے خلافِ معمول
اب نہ رفتار میں بادل ہیں، نہ گفتار میں پھول
کیوں کسی پہ کج ادائی کا لگاؤں اِلزام
اب مرے رُخ پہ ہے وہ صبح، نہ آنکھوں میں وُہ شام
سخت حیراں ہوں کہ اِس پر بھی وفادار "للی"[۱]
تجکو مجھ سوختہ ساماں سے محبّت ہے وُہی
مجکو گھر میں نہیں پاتی تو بہت روتی ہے
اب بھی تو پاؤں مرے چاٹ کے خوش ہوتی ہے
کوئی سُن لے نہ کہیں!

۱۹۴۶ء

[۱]:- مصنف کی کتیا کا نام

ایک قدیم غزل

چشمِ حواس بند ہے، مست ہوں سوز و ساز سے
ملنے چلا ہوں اس طرح حُسنِ جنوں نواز سے

کہتی ہے آسماں سے "ہاں دیکھ یہ سرفرازیاں"
اُٹھ کے جبینِ بندگی، خاکِ رہِ نیاز سے

پھیر دے حُسنِ جاں ستاں، میری نگاہیں پھیر دے
رنگِ طلسمِ دہر سے، عشوۂ حرص و آز سے

مسلکِ حُسن و عشق میں رکھتی ہیں ربط باطنی
میری نیازمندیاں، تیرے غرور و ناز سے

عقل کی مُوشگافیاں، اہلِ خرد کو راس آئیں
میں نے تو تجکو پالیا وحشتِ جاں نواز سے
اس کی کسی کو کیا خبر، پاتا ہے کس قدر نظر
قلبِ حقیقت آشنا حُسنِ رخِ مجاز سے
رُخ سے ہٹا رہے ہیں بال، ڈوبے ہوئے خُمار میں
دیکھ رہے ہیں آئینہ، چونکے ہیں خوابِ ناز سے
مطلعِ کائنات پر چھا گئیں جب سیاہیاں
نکلی تڑپ کے ایک بَرق، جلوہ گہِ حجاز سے
رُوح کو لُطفِ دائمی سوز سے برقِ حُسن کے
دل کو سکُونِ بےخودی عشق کے دردِ راز سے

نغمۂ ہوش تھم گیا، مُطربِ عقل رو دیا
حُسن تڑپ کے رہ گیا میرے جُنوں کے سازسے

چہرے پہ تھی شگفتگی، زلفیں بنا رہا تھا وہ
دیکھا جو مجھکو، ہنس دیا آنکھیں جُھکا کے نازسے

برقِ جمال، مرحبا، پیکرِ ناز، آفریں
دل کو ذرا بھی مَس نہ تھا رسم ورہِ نیاز سے

نغمہ زن و غزل سرا، خلوتِ حُسن سے ذرا
محفلِ عشق میں درآ، پردہ اٹھا کے ناز سے

یہ ہے بہت بڑی دلیل میرے خلوصِ قلب کی
رسمِ وفا نباہ دی تجھ سے زمانہ ساز سے

سوزِ دل و جگر پہ جوش، سیکڑوں صحتیں نثار
میرے مرض کو واسطہ منّتِ چارہ ساز سے

عشق

آپ ہیں کیا واقعی اس وہم میں
عشق سے ہم لوگ باز آجائیں گے

عشق کے کوچے میں پائی ہے حیات
عشق کے کوچے ہی میں مر جائیں گے

عشق دھوکا ہی اگر ہے نزدِ عقل!
ہم قیامت تک یہ دھوکا کھائیں گے

۱۹۳۸ء

(سان فرانسسکو میں ہندستان کے نمائندے)

یہ بات اگر سچ ہے کہ اِس بزمِ جہاں میں
گھوڑوں کے نمائندے ہوا کرتے ہیں خچّر

یہ بات اگر سچ ہے کہ اِس دورِ فلک میں
شیروں کے نمائندے ہوا کرتے ہیں بندر

یہ بات اگر سچ ہے کہ اِس دارِ محن میں
عنبر کا نمائندہ ہوا کرتا ہے گوبر

یہ بات اگر سچ ہے کہ اس عہدِ زبوں میں
شہباز کا ہوتا ہے نمائندہ کبوتر

یہ بات اگر سچ ہے کہ اس اوجِ فضا پر
شاہیں کا نمائندہ ہوا کرتا ہے مچھّر

یہ بات اگر سچ ہے کہ شاہانِ زماں کے
ہوتے ہیں نمائندے غلامانِ محقّر

یہ بات اگر سچ ہے کہ رندانِ جہاں کے
ہوتے ہیں نمائندے فقیہانِ سُبک سر

تو ٹھونک کے سینے کو میں یہ بات کہوں گا
بھارت کے نمائندے ہیں "سرنون" و "مُدلیئر"

سنہ ۱۹۴۵ء

جذبِ کامل

دیدنی تھا دَلولوں کا جذبِ کامل رات کو
ان کے سینے میں دھڑکتا تھا مرا دل رات کو

کاروانِ حسن کا تھا عشق میرِ کارواں
محفلِ گل میں تھی بُلبُل صدرِ محفل رات کو

ہر نفس کھلتے تھے لاکھوں عقدہ ہائے کائنات
حُسن نے چھیڑے تھے کچھ ایسے مسائل رات کو

قِطعہ

بمبئی کا اگر ارادہ ہے
قبر کر لیجئے مری طیّار
میرا ہر لمحہ ہو گا آپ کے بعد
شامِ بیمار و صبحِ بادہ گسار

منظر (۱)

تخلیق سے پیشتر

سینۂ عدم میں وجود کا پیچ و تاب

(حسبِ روایاتِ بیبلیں)

سین (۱)

ایک افسوں بدوش ظلمت میں
ایک گہرے سکوت کا عالم
روئے خنداں، نہ دیدۂ گریاں
جلوۂ گل، نہ رشحۂ شبنم
سازِ دیوانگی، نہ سوزِ خرد
نغمۂ سرخوشی، نہ نوحۂ غم

نہ محبت کا جامۂ صد چاک

نہ جوانی کے گیسوئے پُر خم

سوزِ تخلیق ساز ۔ در پردہ

اور بیرونِ پردہ زیر نہ بم

جیسے بادل کی آڑ میں بجلی

جیسے بربط کے تار میں سرگم

نیم پوشیدہ ۔ گاہ نیم عیاں

باہم آویزشِ وجود و عدم

اک عمیق و رسیدہ معنی میں

لفظ بننے کا جذبۂ محکم

جامد و پا بہ گلِ عناصر میں

اک ابھرتا ہوا سا جذبۂ رم

خود سے گلتی ہوئی سی اک زنجیر

خود سے کھلتا ہوا سا ایک علم

سینۂ قطرگی میں رہ رہ کر

پیچ و تابِ خروشِ موجۂ یم

بول اٹھنے کے شوقِ بے حد سے

خامشی مبتلائے کرب و الم

حرکت میں تخیّلِ موجد

شش جہت میں تصوّرِ عالم

کربِ ناگفتہ حرف ہیں یزداں

فکرِ ناآفریدہ جام ہیں جم

کپکپی ظلمتوں ہیں یوں گویا

نور بننے کی کھا رہی ہے قسم

چند جگنو سے، دم بدم تاباں

چند پلکیں سی پے بہ پے برہم

تیرہ اوجِ خلا پہ جنبش میں

عکسِ تسنیم و پرتوِ زم زم

پُرفسوں ظلمتوں میں پر افشاں

جادوئے آذری و خوابِ صنم

دُھندلی، اُونچی فَضاؤں میں غلطاں
زُلفِ حوّا و دامنِ آدم
سُست کوندے کی طرح لرزش میں
روحِ غفلت پہ ذہن کا پرچم
تیرگی اُس چراغ کے مانند
ہر نفس ہو رہا ہو جو مدّھم
یوں فضاؤں پہ سرگرانی سی
حَمل سے جیسے وحشتِ مریم
ابر دے ذوقِ آفرینش میں
ایک دُھندلے ہلال کا سا خم

ایک کھوئے ہوئے سے جادے پر
ایک رُکتی ہوئی صدائے قدم
ایک اندازہ سا نہ ظن نہ یقیں
ایک اِبہام سا نہ کیف نہ کم
ایک عالم بغیرِ لیل و نہار
ایک پیماں بغیرِ "لا" و "نعم"
اک تپاں حرف نارسیدہ بہ لب
ایک لرزاں نگینہ بے خاتم
ایک چشمک سی بے مقام و جہت
اک تمنّا سی مخفی و مبہم

ایک تعمیر بے در و دیوار

ایک تشکیل بے حدوث و قِدم

اک حکایت بغیرِ گوش و زباں

اک کتابت بغیرِ لوح و قلم

ایک نا دیدہ عُقْدہ، بے ناخُن

ایک آوارہ راز، بے محرم

اور اس آوارہ راز کے اندر

قلبِ خالق کی جُنبشِ پیہم

سین (۲)

عدم سے وجود کی جانب

ایک دُھند لکے کا سماں ہے، چاروں طرف سکوت بہ رہا ہے، گاہ گاہ وجہہ ذُوالجلال سے ایک کرن سی پھوٹتی اور گرد وپیش کے سُہانے پن میں گُم ہو جاتی ہے خدا کے جسم میں رہ رہ کر ایک تشنج کی سی کیفیت پیدا ہوتی ہے۔ وہ اسے بار بار دباتا ہے اور وہ ہر بار تیز سے تیز تر ہوتی جاتی ہے۔ کہ ایک شدید ہیجان کے عالم میں پھریری لے کر خدا اپنا داہنا ہاتھ پوری قوت سے بلند کر کے آواز دیتا ہے۔

خُدا کی پہلی آواز

اے مری تخئیل بن جا کائناتِ ہست و بُود

ہاں بہن اے جذبۂ ایجاد تشریفِ وجُود

اے عدم اُٹھ گامزن ہو شکلِ موجودات میں

اے مرے اِجمال آجا رنگِ تفصیلات میں

ہاں مجسّم حُسن ہو جا اے مرے دل کی ترنگ

اے نویلی سادگی بن جا نگارِ آب و رنگ

محملِ اسماء میں آ جا، لیلیٰ وجہِ جمیل

پردۂ اشکال میں چھپ جا مری روحِ جلیل

حلقۂ امکاں میں در آ اک نئے انداز سے

اے مری ذات، اپنے دامن کو جھٹک کر ناز سے

اے مرے ہیجان بن جا کارگاہِ این و آں

معرضِ ہستی میں آ جا اے زمیں، اے آسماں

یہ کہتے ہی خدا کو پھر شدت کے ساتھ پھریری آتی ہے پھریری آتے ہی وہ اپنے جسم کو جھٹکتا اور اس زور سے جھٹکتا ہے کہ اس کے ہر بُنِ مو سے ایک آنچ سی نکلنے لگتی ہے آنچ میں اتنی ہی سُرعت کے ساتھ گردش کرتی ہوئی بے شمار چنگاریاں کانپنے لگتی ہیں اور کانپتے

کانپتے پورے نظامِ شمسی کی شکل اختیار کر کے توازن، تطابق، حرکت و حرارت اور رنگ و نور کے ایک تابناک عالم میں تبدیل ہوجاتی ہیں۔ خدا اس منظر کو اس تھکے ہوئے لیکن مسرت انگیز سکون کے ساتھ دیکھتا ہے۔ جو کسی درد کے رفع ہونے کے بعد محسوس ہوا کرتا ہے۔ وہ مسکراتا ہے۔ دوبارہ مسکراتا ہے۔ اور پھر ایک ایسی رُستگاری آمیز تسکین کے ساتھ قہقہہ لگا کر دفعتہً نگاہوں سے اوجھل ہوجاتا ہے۔ جو کاندھے سے کوئی زبردست وزن گرا دینے کے بعد حاصل ہوا کرتی ہے۔

منظر (۲)

خلقت کے ایک مدت دراز کے بعد

خدا پہلی بار عرش کا دریچہ کھول کر غیر آباد کرۂ ارض پر نگاہ ڈالتے ہوئے ارشاد فرماتا ہے

سین (۱) یہ رباطِ حُسن و خوبی، یہ بساطِ رنگ و بو
یہ سُرورِ لالہ و گُل، یہ سُرودِ آب جو

یہ شگوفے، یہ ستارے، یہ بگولے، یہ حباب

یہ بیاباں، یہ بہاراں، یہ سمندر، یہ سراب

یہ رُباب دورِ گل، یہ نغمۂ بادِ مراد

یہ خروشِ قلزم و طُوفاں، یہ جوشِ ابر و باد

یہ فلک کی تازہ کاری، یہ فضا کی طُرفگی

یہ گھٹا یہ دھوپ یہ کُہرا، یہ مینہ، یہ چاندنی

یہ خنک شاداب شاخیں پھُول برساتی ہوئی

ندّیاں یہ بن کے اندر پیچ و خم کھاتی ہوئی

صُبح کی یہ نور دوڑاتی ہوئی قرصِ رواں

شام کی یہ کروٹیں لیتی ہوئی تاریکیاں

یہ قمر، یہ کہکشاں، یہ کوہ، یہ وادی، یہ بَن

بَن کے اندر یہ خمِ آبِ رواں کا بانکپن

یہ صبیح و نرم صُبحیں، یہ سہانے بوستاں

یہ سلونے جھٹ پُٹے، یہ سانولی تاریکیاں

معرضِ جُنبش میں یہ کھلتی ہوئی کلیوں کا رنگ

رنگ کے ہیجان میں یہ پھول بننے کی اُمنگ

پرفسوں یہ دشت، پراسرار یہ پست و بلند

تیرگی میں بے حقیقت، روشنی میں ارجمند

یہ شبِ مہتاب و روزِ ابر و فصلِ برشگال

یہ خرامِ جو، یہ موجِ سبزہ، یہ بادِ شمال

یہ ضیا، بحر و بر، یہ جلوۂ کوہ و کمر
کس قدر ضَو بار ہے یہ عالمِ شمس و قمر!

یہ کہکر خدا ٹھہر جاتا ہے — اور پھر کچھ رُکتی سی آواز میں کہتا ہے :۔

کس قدر ضو بار ہے یہ عالمِ شمس و قمر!

اور پھر کچھ سوچ کر دوبارہ دھیمی آواز سے ارشاد فرماتا ہے :۔

کس قدر ضو بار ہے یہ عالمِ شمس و قمر!

یہ کہتے ہی خدا کی آنکھیں خاکدان کے سینے میں پیوست ہو جاتی ہیں اور وہ طُرفۃ العین میں یہ معلوم کر کے کہ سینۂ ارض کے اندر کیا تمنا کروٹیں لے رہی ہے پھر کہنا شروع کرتا ہے :۔

خاک کی تمنّا

لے رہے ہیں کروٹوں پر کروٹیں لیل و نہار
ہاں میں سمجھا۔ اس کُرے کو ہے کسی کا انتظار
آرزو یہ کس کے نغموں کی ہے؟ یہ کیا راز ہے
خاک کا ایک ایک ذرّہ، گوش بر آواز ہے
وہ ثباتِ کوہساراں ہو کہ رقصِ آب جو
دہر کی ہر چیز کا دل ہے شہیدِ آرزو
اک کھٹک سی ہو رہی ہے قلبِ موجودات میں
ایک پرتَو سا ہے غلطاں سینۂ ذرّات میں

یہ جو ہوتی ہے دھمک رہ رہ کے نبضِ تاک میں
اپنے ساقی کی یہ حسرت ہے بطونِ خاک میں
ایک اک تارا ہے، نغمے شوق کے گاتا ہوا
اشتیاقِ دید میں پلکیں سی جھپکاتا ہوا
ایک اک ساعت میں غلطاں ہے خروشِ آرزو
وقت کے سینے میں ہے روشن چراغِ آرزو
قلب کی حاجت ہے اس بے چین سینے کیلئے
یہ انگوٹھی تلملاتی ہے نگینے کے لئے

خدا کی یہ آواز سنتے ہی ذرّات، بگولوں کی شکل میں آسمان کی جانب بلند ہونے لگتے ہیں۔ پنکھڑیوں کی نہوں میں ایک گہرا رنگ دوڑنے لگتا ہے، دریاؤں کی روانی میں تیزی آجاتی ہے، اور درخت یک بارگی جھومنے لگتے ہیں — اور خدا نگاہوں سے اوجھل ہوجاتا ہے۔

ارادۂ تخلیقِ انساں

خدا کرسی پر متمکن ہے جس کے ذہن میں انسان کا ہیولیٰ غلطیدہ ہے سامنے کرۂ
ارض کا پرتو فضا میں کانپ رہا ہے اور خدا اس تمنا سے بے چین پرتو کی طرف
آنکھیں اٹھا کر بڑی گرمجوشی کے ساتھ ارشاد فرماتا ہے :-

ہاں، میں بخشوں گا اسے انسان سے تابندگی

کہ اتنے میں چند رکتے ہوئے قدموں کی چاپ محسوس ہوتی ہے. خدا
ناخوشگواری کے ساتھ ادھر گردن موڑتا ہے، اور دیکھتا ہے کہ چند فرشتے
سروں کو جھکائے اور ہاتھوں کو جوڑے ادب اور خوف کے ساتھ بڑھتے
چلے آرہے ہیں :-

جنھیں دیکھ کر خدا کہتا ہے :-

کیا ہوا، اس احتجاجی شکل سے آئے ہو کیوں ؟

(ایک نسبتہً معمر فرشتہ آگے بڑھ کر)

فرشتوں کا اعتراض

خانہ زادوں کے دلوں پر یہ پڑا ہے عکس ابھی
خلقتِ انساں پہ مائل ہے دماغِ داوری
بارگاہِ نور میں حاصل ہو کیوں ظلمت کو بار
ہم تری تسبیح کو کیا کم ہیں اے پروردگار
ان پہ اشکوں کی نمی ہے، ان پہ سجدوں کا نشاں
یہ ہماری داڑھیاں ہیں دیکھ یہ پیشانیاں
ماسوا اس کے ضمیرِ آب و گل میں ہے جنوں
خاک پر تیری بہائے گا شقیِ انسان خوں

اُس کے نیزے ٹوٹ جائیں اور علم میرے گڑیں

یہ اسی دُھن میں ہلا دیگا پہاڑوں کی جڑیں

ہر عمل اس کا بنے گا اِک زبوں ردِّ عمل

اے خدا لاشوں سے پٹ جائیں گے یہ دشت و جبل

پھُول رونْدے جائیں گے، پودے اُکھاڑے جائیں گے

سینہ ہائے بحر و بر معبود پھاڑے جائیں گے

کاٹ دے گی خون کے رشتوں کو تیغِ شعلہ رُو

بھائی کی تلوار سے بھائی کا ٹپکے گا لہو

حشر تک بوتا رہے گا کشتِ جاں میں تخم شر

اور کبھی انجام سے بھی یہ نہ ہوگا بہرہ ور

پہلے تو ٹھٹھے کسے گا یہ تری آیات پر
اور ہنسے گا پھر یہ خود تیری مقدّس ذات پر
دھوپ سنولا جائے گی اور چاندنی کھو جائے گی
ظلمتوں کے پالنے میں روشنی سو جائے گی
طبعِ عالی پر گرانی ہو گی بے حدّ و حساب
فتنۂ خوابیدہ کو رہنے بھی دے مصروفِ خواب
پھر وہی ہم عرض کرتے ہیں بچشمِ اشکبار
ہم تری تسبیح کو کیا کم ہیں اے پروردگار
اِن پہ اشکوں کی نمی ہے، اِن پہ سجدوں کے نشاں
یہ ہماری ڈاڑھیاں ہیں، دیکھ یہ پیشانیاں

یہ سنتے ہی خدا بگڑ کر جواب دیتا ہے :۔

معترض فرشتوں کو خدا کا جواب

اے کہ رہتے ہو سدا اپنی ہی آوازوں میں گم
مشورہ دینے کی خاطر مجھکو اور آئے ہو تم
لیلئ اسرار کو پہچان سکتے ہی نہیں
جو ہے میرے علم میں تم جان سکتے ہی نہیں
ربط بھی معلوم ہے آغاز میں انجام میں
جاؤ اور لگ جاؤ جا کر اپنے کام میں

یہ سنتے ہی فرشتے شرمندگی اور خوف کے ساتھ اُلٹے قدموں بھاگتے اور عرش کی۔

سیڑھیوں سے اُترتے ہی زمیں پر گر جاتے ہیں ـــــ اور خدا دوبارہ خاطر کو جمع فرما کر فضا میں کانپتے ہوئے کرۂ ارض کے پرتو کی جانب آنکھیں اٹھا کر کہنا شروع کرتا ہے:۔

ہاں میں بخشوں گا اسے انساں سے تابندگی

اور پھر دفعتاً معترض فرشتوں کا خیال آتے ہی زیرِ لب:۔

یہ فرشتے بھی ہیں کتنے کم نگاہ و کم سواد ـــــ؟

اور پھر سہ بارہ فضا میں کانپتے ہوئے کرہ ارض کے پرتو پر نگاہیں جما کر انسان سے بلند ترین امیدیں وابستہ کر کے کہتا ہے:۔

ہاں میں بخشوں گا اسے اِنساں سی تابندگی

کون انساں؟ نازِ مخلوقات و فخرِ زندگی

کون انساں؟ فاتحِ کونین، امیرِ آب و گِل

سینۂ آفاق کا لرزندہ و بیدار دل

نورِ گیتی، مشعلِ افلاک، شمعِ انجمن
اِک مجسّم کج کلاہی، اِک سراپا بانکپن

ناصرِ اوجِ نگاراں، ناظمِ ابرو چمن
ناظرِ موجِ بہاراں، ناقدِ سرو سمن

مدعائے آسمان و مقصدِ روئے زمیں
مرکزِ اضدادِ عالم، محورِ دنیا و دیں

شارحِ آیاتِ ہستی، شارعِ دینِ حیات
قاضیٔ شہرِ صفات و کاتبِ دیوانِ ذات

مکتبِ نور و حرارت، درسگاہِ خیر و شر
صاحبِ نار و برودت، راکبِ شمس و قمر

دور بینِ خشک و تر، معیارِ نقدِ مدح و ذم

خورد بینِ آب و گل، میزانِ جنسِ کیف و کم

شاہِ گیتی، صاحبِ آفاق، دارائے حیات

ابرِ رحمت، وارثِ فطرت، رئیسِ کائنات

اِک زمیں پرور محقّق، اک فلک پیما حکیم

ایک مقیاسِ تحمّل، اک رَصدگاہِ عظیم

آسماں کا داور و دارا، زمیں کا کج کُلاہ

بَر کا آقا، بحر کا مولا، فضا کا بادشاہ

دہر کی پیدا و پنہاں طاقتوں کا شہریار

نظم کا پیغامبر، آئین کا پروردگار

طُرفہ بازی گاہِ موجودات کا اسرار باز

اَوج کا نبّاض، پستی کا طبیب و چارہ ساز

برق پیما ابلقِ شام و سحر کا شہسوار

جنبشوں کا میرِ لشکر، گردشوں کا تاجدار

عرصۂ تابش کی ضو رفتار فوجوں کا نشاں

بحرِ ظلمت کی سبک رو کشتیوں کا بادباں

روشنی کا نغمہ، فطرت کا سخن، حق کا پیام

مہر و مہ کا مقتدا، سرکشِ عناصر کا امام

عالمِ اسباب کی محرابِ اعظم کا چراغ

پیکرِ ارض و سما کے کاسۂ سر کا دماغ

چشمِ ہستی کی بصارت، زندگی کا رازداں
خامشی کا زمزمہ، گونگے حقائق کی زباں
خونِ گل دوڑائے گا جوان خس و خاشاک میں
نفخ کردوں گا خود اپنی روح جس کی خاک میں

یہ کہتے ہی خدا ایک خاص ولولے کے ساتھ کھڑا ہو جاتا ہے۔ ماتھے سے یکایک سفید لو نکلنے لگتی ہے جو رفتہ رفتہ سُرخ ہوتی چلی جاتی ہے، اور آخر کار انسانی پیکر اختیار کر لیتی ہے کہ خدا اپنے سر کو جنبش دیتا ہے، اور دفعتًہ انسان ادب سے سر جھکائے خدا کے سامنے آکر کھڑا ہو جاتا ہے تمام ملائکہ مقربین پر ہیبت طاری ہو جاتی ہے، عرش کے کنگرے چمکنے لگتے ہیں، اور خدا آمرانہ تمکنت کے ساتھ ملائکہ کی طرف آنکھیں اٹھا کر حکم دیتا ہے:۔

سر جھکا دو اے فرشتو زندگی کے سامنے
خاک پر رکھ دو جبینیں آدمی کے سامنے

کہ تمام فرشتے سجدے میں گر پڑتے ہیں، تسبیح و تہلیل کے نعرے بلند ہو جاتے ہیں، لیکن

ابلیس غرور سے گردن کو کج کئے ہوئے، اُلٹے قدموں پیچھے ہٹ کر کھڑا ہو جاتا ہے اور اس سرتابی سے برہم ہو کر خُدا ابلیس کو ڈانٹتا ہے:۔

خُدا

بدگہر، یہ سرکشی، یہ زعمِ باطل یہ غرور
کس لئے جھکتا نہیں کمبخت آدم کے حضور

ابلیس

کام لے اِدراک سے بارِ خدا ادراک سے

خدا بگڑ کر

کیا کہا میں کام لوں! کیا کام لوں اِدراک سے

ابلیس

یہ کہ ابلیس آگ سے ہے اور آدم خاک سے

خُدا

ہاں میں واقف ہوں کہ شیطاں نار آدم طین ہے

ابلیس

خاک کے قدموں پہ گرنا آگ کی توہین ہے

خُدا

"آگ کی توہین ہے" یہ طنطنہ یہ طمطراق

ابلیس

شق ہو میرے سر پہ شق ہو گُنبدِ فیروزہ طاق
مجھ سے کہتا ہے خدا "یہ طنطنہ یہ طمطراق"
طنطنہ تو ہے مرا عینِ مزاجِ آتشیں

(کہ خدا بات کاٹ کر)

خاک پر ناداں فرشتے، خاک پر رکھدے جبیں

(ابلیس سر کو جنبش دے کر)

اُف یہ سر اور آدم خاکی، نہیں ہرگز نہیں

(خُدا سُرخ ہو کر)

کیا کہا؟ ہرگز نہیں، کیوں اے سراپا بُغض و کیں

دور ہو اے آتشِ مردود، اے روحِ لعیں

حشر تک برسیگی لعنت تجھ پہ غرب و شرق سے

اے رِضا کے تاج گر جا اس شقی کے فرق سے

کہ دفعتہ ابلیس کا سر برہنہ ہو جاتا ہے، وہ بگڑے ہوئے تیوروں سے خدا کو دیکھ کر کچھ کہنا ہی چاہتا ہے کہ خدا پھر گرجنے لگتا ہے:۔

خُدا

یہ بَرَر، یہ اینٹھ، یہ ضِد، یہ اکڑ، یہ آن بان
عرش سے جا فرش پر گر پڑ زمیں کی خاک چھان

(ابلیس عرش سے جاتے ہوئے، خدا کی جانب اپنی شعلہ بار آنکھیں پھیر کر)

انبیاء کو کیا زمیں کی سمت بھیجا جائے گا؟

(خدا غضبناک ہو کر)

کھائے گا او باغی و ملعون دھوکا کھائے گا

(ابلیس زور سے پاؤں پٹک کر)

خیر دیکھا جائے گا معبود! دیکھا جائے گا

کہ یکایک ابلیس دونوں پاؤں جوڑ کر زمین کی طرف چھلانگ لگاتا ہے۔ اس کے پر ہوا میں

پھڑ پھڑا کر ایک نہایت بھدا شور پیدا کرتے ہیں۔ تمام ملائکہ مقربین کا منہ اتر جاتا ہے، آدم جھک کر ابلیس کو دیکھتا ہے۔ اور ماتھے سے پسینے کی بوندیں ٹپکنے لگتی ہیں ـــــ کہ تمام منظر تاریکی میں گم ہو جاتا ہے:۔

منظر ۶ - عرش

خدا ایک ایسے عالم میں جیسے وہ کسی بہت بڑے احسان کا عزم کر چکا ہے، آدم کو عرش کے کھلے ہوئے دریچے میں اپنے دونوں ہاتھوں پر بند کسے ہوئے، کرۂ ارض کی جانب دیکھ کر آواز دے رہا ہے:۔

اے زمیں آباد ہو جا آشنائے راز سے

گونج اُٹھ اے آسماں انسان کی آواز سے

اے خموشی بڑھ، رکابِ نطقِ آدم تھامنے

اے پہاڑو سر جھکا دو، آدمی کے سامنے

اپنی تمکیں سے خبردار اے عروسِ بحر و بر

ہو رہا ہے خاک پر اسرارِ حق کا پردہ در

ہاں اُبل پڑ سینۂ انگور سے موجِ شراب

شاید آفاق کے چہرے سے اٹھ جائے نقاب

اے سمندر ہاں ادب کے ساتھ شورِ پیچ و تاب

پاک انساں کے قدم لے دہکتے آفتاب

ہاں اٹھ اے آفاق، استقبالِ آدم کیلئے

سرو قد ہو اے عناصر خیر مقدم کیلئے

سختیوں کو ترک کردو، نرمیوں سے کام لو

ابر و برف و باد! طوفانوں کی باگیں تھام لو

پیشوائی کو ادب سے پیشوائی کو بڑھو

اے کڑکتی بجلیو، اے گھڑگھڑاتے بادلو

اے شگوفو مسکراؤ، آبشارو گیت گاؤ

گنگناؤ اے ہواؤ، اے پرندو چہچہاؤ

بخشتا ہوں لے تجھے روحِ عظیم و نفسِ پاک

ہاں کلاہِ فخر کج کر لے جواں اقبال خاک

ہوش میں آ اے غنودہ فرشِ خاکی ہوش میں

کچھ خبر ہے عرش آتا ہے تری آغوش میں

آدم کا نزول

منظر (۷) زمین

آدم ہواؤں کے بازوؤں پر زمین کی طرف اُتر رہا ہے، سطح زمیں اس طرح بلند و پست ہو رہی ہے گویا اسکا دل دھڑک رہا ہے، جنگلوں پر ایک رقص کی سی کیفیت طاری ہے، عناصر میں ایک اعتدال آمیز حرکت رہ رہ کر رونما ہو رہی ہے ہوائیں سنسنا، اور پودے لچک رہے ہیں کہ تھوڑی دیر میں نرم رو ہوائیں آدم کو ایک سمندر کے کنارے مرغزار میں لاکر اتار دیتی ہیں، تھوڑی دیر کے واسطے ہر شے ساکن ہو جاتی ہے، ایسا معلوم ہوتا ہے گویا تمام عالم آدم سے معانقہ کر رہا ہے، اور اس کے چند ہی نفس کے بعد جب سمندر کی لہریں مچل مچل اور ابھر ابھر کر آدم کے پاؤں چومنے لگتی ہیں تو آدم اپنے گرد و پیش نظر ڈال کر انگڑائی لیتا ہے، اور اس کے انگڑائی لیتے ہی:-

ذرہ ذرہ سے اٹھی اک تازہ موجِ زندگی

آسمانوں نے علم کھوئے زمیں نے سانس لی

بھاپ بن کر چھائی میدانوں پہ روحِ بحر و بر

دید کی خاطر پہاڑوں نے اٹھائے اپنے سر

سنسنائی سینۂ فولاد میں تیغِ دو دم

پتھروں میں کسمسائے ناتراشیدہ صنم

خفتہ میدانوں میں شہروں کا تخیل جاگ اٹھا

ایک پرتو سا در و دیوار کا پڑنے لگا

لیلیٔ تعمیر کا رخسار لو دینے لگا

گونج اٹھی کہسار کے سینے میں تیشے کی صدا

حکمِ قدرت کو لئے موجِ ہوا آنے لگی

"با ادب، با ہوش" کی پیہم صدا آنے لگی

ذوقِ ایجادات و صنعت کا بگل بجنے لگا
آئی طبلِ عالمِ خاکی سے "دوں دوں" کی صدا
اپنے میثاق اطاعت کو سنانے کے لئے
آئیں ساری قوتیں عالم کی صف باندھے ہوئے
سامنے آ آ کے اشیاء نے بتائے اپنے نام
ہو سکے، بپھرے عناصر نے کیا جھک کر سلام
تُند طوفانوں کی اکڑی گردنیں خم ہو گئیں
احتراماً قدِ آدم بحر کی موجیں اٹھیں
رکھ کے کشتی میں خواصِ ایں و آں بحرِ خراج
نذر کو آیا قوائے کارفرما کا مزاج

جُھک گئی ہستی مودّب ہو گئے ارض و سما

شاہدانِ دہر نے وا کر دیئے بندِ قبا

روشنی کو سینۂ ظلمت میں راہیں مل گئیں

خاک کے در کھل گئے، کانوں کی بابیں کھل گئیں

نو عروس دہر نے زلفوں کو برہم کر دیا

چاند مُجرے کو جُھکا، سورج نے سَر خَم کر دیا

منظر (۸)

جھٹ پٹے کا وقت ہے آدم ایک جنگل میں تنہا ٹہل رہا ہے، آبشار جاری ہیں، دریا زور شور سے بہہ رہا ہے، ہوائیں سنسنا رہی ہیں، ابر پارے آوارہ پھر رہے ہیں اور آدم ایک عجیب ناقابل فہم بے چینی کے عالم میں اِدھر اُدھر سپاٹ آنکھوں سے دیکھتا ہوا زیر لب دل ہی دل میں کہہ رہا ہے :-

حیراں ہوں خاک پر ہے یہ کیا زندگی کا طور

ہر ساعت ایک فکر ہے، ہر سانس ایک غور

دریا، درخت، سبزہ، سکوں، ابر، آبشار

ہر چند دلفریب ہے، لیکن یہ قلبِ زار

سینے میں مثلِ شعلہ بھڑکتا ہے کس لئے

کیا چیز ڈھونڈتا ہے دھڑکتا ہے کس لئے

کچھ اسکی اصل بھی ہے کہ وسواس ہے مجھے؟

کس چیز کی کمی کا یہ احساس ہے مجھے؟

ہر لمحہ ایک دُھن ہے تو ہر آن اک کُرید!

اور کیوں ہے، کس بنا پہ ہے؟ کھلتا نہیں یہ بھید

ساکن ہوں اور خیال ہے آوارہ چارسو
کس چیز کی تلاش ہے، کس شے کی آرزو

یہ واقعہ عجیب ہے یہ مرحلہ عجیب
خود سے ہوں فاصلہ پہ کبھی اور کبھی قریب

اور بالخصوص فکر میں جھکتی ہے جب جبیں
خود کو ٹٹولتا ہوں کہ میں ہوں بھی یا نہیں

رہتی ہے مثلِ ابر مسلّط دماغ پر
سنجیدگی رموزِ خفی سے عمیق تر

سینے میں کانپتی ہے مرے ایک موجِ نور
دل سے قریب، فہم سے بالا، نظر سے دور

رہتا ہوں ایک طرفہ تقاضے سے مضمحل

اپنے سے دور دور مناظر سے متّصل

رہتا ہوں کیوں اداس سا آنسو پیئے ہوئے

کیسی یہ سنسنی ہوں رگوں میں لئے ہوئے

گونجی ہوئی ہیں کس کے قدم کی یہ آہٹیں

کیسی یہ میرے جسم میں ہیں کسمساہٹیں

چھالا سا دل میں وقتِ سحر پھوٹتا ہے کیوں؟

راتوں کو نامراد بدن ٹوٹتا ہے کیوں؟

بادِ شمال ہو کہ وہ ابرِ جواں خرام

ناقص ہر ایک چیز ہے، ہر شے ہے ناتمام

احساس ناتمامیٔ عالم تو ہے مگر
ابتک ہوں ناتمام کے معنی سے بے خبر

کوندا سا اک لپکتا ہے ہر شاخِ تاک پر
پرتو سا ایک کانپتا رہتا ہے خاک پر

دورانِ خون میں ہے رواں ایک تیز دھار
خود اپنی سانس سینے میں چُبھتی ہے بار بار

کچھ اجنبی زبان میں کرتی ہے گفتگو
راتوں کو ایک بعید سی موہوم آرزو

چشموں کو کیا کروں لبِ ساحل کو کیا کروں
اس نامرادِ کشمکشِ دل کو کیا کروں

لے :- میں ایسے مواقع پر "ن" کے اعلان کو جائز سمجھتا ہوں۔

خود اپنے ولولوں کو بھی پہچانتا نہیں
کس راستے کے موڑ پہ ہوں جانتا نہیں

منظر (۹)

آدم کی اس حدیثِ نفس کی آواز عرش پر جاتی ہے، خُدا چونکّا سا ہو جاتا ہے گردن پہلے نیچے جھکاتا ہے، پھر اوپر اٹھاتا ہے، اور تخت سے نیچے اتر کر ٹہلنے لگتا ہے، اور ٹہل ٹہل کر بار بار کہتا ہے:۔

"اس نامرادِ کشمکشِ دل کو کیا کروں"

اور پھر یکایک ٹھہر جاتا ہے، سر پر ہات پھیرتا ہے، کچھ سوچتا ہے، دیر تک سوچتا ہے، اور آخر کار خفیف سا متبسّم ہو کر سر کو ہلکی سی جنبش دیتے ہوئے زیرِ لب کہتا ہے:۔

ہاں ــــ نامرادِ کشمکشِ دل کو کیا کروں،

اور پھر ایک لمحہ خاموش رہکر، آنکھوں کو ایک خاص عزم آمیز انداز

سے گردش دیتے ہوئے ہاتھ اٹھا کر:۔

مہیّا زخم کا ہوتا ہے مرہم　　مبارک باد مرگِ نوبہ آدم

منظر (۱۰)

آفتاب کے غروب ہوتے ہی قلب آدم اور سینۂ ارض پر خشیت الٰہی کا عکس کانپنے لگتا ہے، آدم دفعتہ گھبراسا جاتا ہے، دیوانہ وار ادھر اُدھر دیکھتا ہے، لیکن اس کی سمجھ میں اس داخلی و خارجی تبدیلی کا مفہوم کچھ نہیں آتا، وہ عجیب حیرت آمیز اور جوشیلے انداز سے یہ آواز جلی دل ہی دل میں کہتا ہے:۔

یہ کس شئے کی نرالی، اجنبی، نا آشنا ضو ہے؟

یہ کس نورِ خفی کا نورس و موہوم پر تو ہے؟

یہ میرے گرد کیسا درمیانی سا اُجالا ہے؟

جو سطحِ روشنی سی پست ہے ظلمت سے بالا ہے؟

نہ جانے راستے میں ہیں کہ محوِ رقص منزل ہیں
یہ کیسے تلخ و شیریں ولولوں کی دھوم ہے دل میں
یہ کس ناخن کا پرتو پڑ رہا ہے عُقدۂ دل پر؟
یہ لو کیسی ہے جو رہ رہ کے کانپ اُٹھتی ہے ساحل پر
یہ کیا ہے روحِ ساحل جاگتی ہے اور نہ سوتی ہے
ندی کے موڑ پر اک داستاں معلوم ہوتی ہے!
فضا میں دائرے سے بن رہے ہیں، کیا تلاطم ہے،
یہ طوفانِ حقیقت ہے کہ طغیانِ توہّم ہے
یہ کیسی گھٹتی بڑھتی دل نشیں آواز آتی ہے
کہ جیسے اک گرہ لگتی ہے لگ کر کھل سی جاتی ہے

یہ کس نا آشنا سے میہماں کی آمد آمد ہے؟
یہ کس بے سمجھے بوجھے کارواں کی آمد آمد ہے؟
یہ کیا عالم ہے ہر شے سحرِ ظلمت میں ڈوبتی ہے؟
یہ کس کی سانس چہرے پر مجھے محسوس ہوتی ہے؟
ہوئی اُف یک بیک یہ میری نبضوں میں دھمک کیسی؟
ارے یہ دفعتاً جنبش سی کیسی — یہ چمک کیسی؟
یہ آہٹ کس کی یوں گونجی مرے بے چین سینے میں؟
صبا جیسے کلی میں، راگنی جیسے سفینے میں
یہاں آیا ہے کوئی، یا جنوں نے مجھ کو گھیرا ہے
ارے یہ کس کا شانہ مَس ہوا، تو کون ہے! کیا ہے؟

منظر (۱۱)

صُبحِ کاذب کا وقت ہے، آدم عالم سرشاری میں ایک پہاڑی پر ٹہل ٹہل کر جو سبز و شاداب اور چشموں کے زمزموں سے گونجی ہوئی ہے، حیرت و حسرت کے ساتھ گنگنا رہا ہے:-

واقعہ تھا کہ گماں تھا مجھے معلوم نہیں
کل یہ کیا طرفہ سماں تھا مجھے معلوم نہیں
پرتوِ صُبح کے مانند زمیں کی جانب
کون شب کو نگراں تھا مجھے معلوم نہیں
ذرّے ذرّے سے جوانی کی مہک آتی تھی
کس کا لب عطر فشاں تھا مجھے معلوم نہیں

ایک چشمے کی سی آواز تو آتی تھی ضرور
اور وہ چشمہ کہاں تھا مجھے معلوم نہیں
جس کی رفتار سے تھی کاہکشاں جنبش میں
کون وہ سروِ رواں تھا مجھے معلوم نہیں
چاند کا سینہ، ستاروں کا جگر، خاک کا دل
کس کی شوخی سے تپاں تھا مجھے معلوم نہیں
بامِ گردوں پہ فسانوں نے عَلم کھولا تھا
یا حقیقت کا نشاں تھا مجھے معلوم نہیں
آسمانوں سے برستے تھے خوشی کے گوہر
یا فلک اشک فشاں تھا مجھے معلوم نہیں

جھٹ پٹے کی شکن آلود فضا کے پیچھے

دوست یا دشمنِ جاں تھا مجھے معلوم نہیں

شام کی جنبشِ تاباں کی گھبراہٹ میں

کون یہ نیم عیاں تھا مجھے معلوم نہیں!

کہ اتنے میں صبح صادق کی سرخیاں اُفق پر جگمگانے لگتی ہیں. آسمان پر ایک انوکھے نور کا چشمہ سا پھوٹ نکلتا ہے، جو ہلکی روشنی اور ہلکے رنگ کا طوفان بن کر نیچے اترتا ہے اور تمام کرۂ ارض کو رنگین بنا دیتا ہے، اور اس رنگ و نور کے پیچھے پیچھے سماوی ترانوں کا ایک کارواں حرکت کرتا ہوا زمین پر وارد ہوتا ہے جس سے تمام عالم پست و بالا بھیروں کی ملائم تانوں سے گونج اٹھتا ہے، آدم گھبرا کر آنکھیں اوپر اٹھاتا ہے اور دیکھتا ہے کہ دھندلے سے زریں اُفق پر ایک گنگا جمنی حلقہ ہے جس کے اندر حورانِ بہشتی ایک پیکرِ لطیف و بلوریں کا احاطہ کیے ہوئے زمین کی طرف دیکھ دیکھ کر مبارکباد کا ترانہ گا رہی ہیں :-

حوروں کا ترانۂ مبارک باد

مبارک حضرتِ انساں مبارک
مبارک جلوۂ جاناں مبارک

وفورِ غم کو عشرت کی بشارت
ہجومِ درد کو درماں مبارک

شبِ تاریک کی خاموشیوں میں
خروشِ مرغِ خوش الحاں مبارک

نگاہِ رہروِ راہِ طلب کو
سوادِ کوچۂ جاناں مبارک

خمِ محرابِ چشمِ آرزو کو
چراغِ چہرۂ خنداں مبارک

فضائے شامِ غم کی غنچگی کو
نسیمِ صبحِ گل افشاں مبارک

سکوتِ موسمِ لب تشنگی کو
سرودِ بربطِ و باراں مبارک

وفورِ کلفتِ پیدائے غم کو
ہجومِ عشرتِ پنہاں مبارک

ہوائے بخیۂ زخمِ جگر کو
ادائے جنبشِ مژگاں مبارک

لبِ اُمید کو موجِ تبسّم
بہ فیضِ دیدۂ گریاں مُبارک
سُبک رفتار موجِ زندگی کو
مبارک دولتِ طوفاں مُبارک

آدم یہ ترانہ سنکر وجد میں آجاتا ہے، بار بار ٹھہر کر دل پر ہات رکھتا ہے اور پھر جھومنے لگتا ہے کہ اتنے میں آسمان سے انوار کی بارش ہونے لگتی ہے، ہوائیں گنگنانے اور شاخیں لچکنے لگتی ہیں اور حوا رنگینی و برنائی اور افسانہ و افسوں میں لپٹی ہوئی شاداب پہاڑیوں کے رنگین دائرے میں اس طرح اترتی ہے جیسے انگوٹھی پر نگینہ جڑ دیا گیا ہو۔ اور اترتے ہی دونوں ہاتھوں سے تھوڑی دیر کے لئے اپنے چہرے کو چھپا لیتی ہے، آدم غور سے دیکھتا ہے لیکن فرطِ حیرت و فراوانی و مسرت سے جُنبش نہیں کر سکتا کہ اتنے میں حوا اپنے چہرے سے دونوں ہات ہٹا کر مُسکراتی ہے اور اس کے مُسکراتے ہی :-

کروٹیں ذرّوں نے لیں، غنچوں نے آنکھیں کھول دیں

آسماں جھوما، نرت کرنے لگی کم سن زمیں

سر پہ پہلی بار چمکا قوس کا رنگین پُل

گلشنِ ہستی میں پہلی بار لچکی شاخِ گُل

غنچگی نے مسکرا کر پہنا پھولوں کا لباس

چہرۂ گیتی پہ پہلی مرتبہ اُتری مٹھاس

درس پہلی بار دُنیا کو لطافت کا ملا

اوّلیں نغمہ چھڑا، اور اوّلیں غنچہ کھلا

گُل کے پیراہن سے پہلی بار نکلی بُوئے گُل

تاک کے خوشے سے پہلی بار ٹپکا خونِ مُل

اک لگاوٹ سی ہوئی پیدا، بنی جو بڑھ کے لاگ
نے سے پہلی بار نکلی نغمۂ سوزاں کی آگ

ابتدا ہی شدّتِ احساس میں ڈوبا ہوا
دیدۂ ارض و سما سے اولیں آنسو گرا

اور پھر گھر کر تمنّاؤں کا بادل آگیا
گھر کے گرجا اور گرج کر اک جہاں پر چھا گیا

پھر تو برسانے لگا ذوقِ جنوں ذوقِ نگاہ
خاک پر اُمڈی جوانی کا جمالِ بے پناہ

عہد بے خود ہوئے برنائی اُٹھلانے لگی
شوخیاں مچلیں، جوانی رقص فرمانے لگی

یوں کھنچے ابرو نئے سانچے میں عالم ڈھل گیا

یوں ہلیں پلکیں رگِ ہستی پہ نشتر چل گیا

کانپتی، تپتی، دہکتی حسرتیں پیدا ہوئیں

زندگی کے طاقِ کافوری میں شمعیں جل اٹھیں

عرش نے بربط اٹھایا، فرش کی لچکی کمر

رسمسائے ماہ و انجم گنگنائے بحر و بر

جوہروں میں دلنشیں بُندے جھمکنے سے لگے

سینۂ الماس میں کنگن جھلکنے سے لگے

نرم ریشم کی تمنّا دہر پر چھانے لگی

اک خیالی سرسراہٹ کی صدا آنے لگی

سینۂ دوشیزۂ گیتی کے اندر ناگہاں

کروٹیں لینے لگا ذوقِ حریر و پرنیاں

عارضِ بے آب گوہر پہ صباحت چھا گئی

روئے زر پر خون یوں دوڑا کہ سُرخی آ گئی

سینۂ گوہر میں بندھنے کی تمنا جاگ اُٹھی

قلب سیم و زر میں اک پازیب سی بجنے لگی

دفعتاً عالم کی پہنائی پہ گویا چھا گئی

پاک بچّوں کے تبسم کی سہانی چاندنی

کھلکھلا اٹھّے شگوفے، چہچہا اُٹھّے طیور

نغمہ گونجا زیر و بالا، رنگ دوڑا دُور دُور

جھوم کر گھنگھور ساون کی گھٹا آئے گی
زمزمے چھوے صبا چہکی، فضا گائے گی

کہ آدم حواس وہمت کو مجتمع کر کے حوّا کی طرف آہستہ آہستہ بڑھتا ہے، موجودات کی نبض تیز سے تیز تر ہو جاتی ہے۔ پہلی کرن کے پھوٹنے کے آثار اُفق پر مچلنے لگتے ہیں شاخیں رہ رہ کر بار بار جھومتی کلیاں رہ رہ کر بار بار مُسکراتی اور طیور رہ رہ کر بار بار چہچہاتے ہیں اور آدم ایک عجیب بست وکشاد اور انقباض وانشراح کے سنجیدہ عالم میں دھڑکتے ہوئے دل اور جھپکتی ہوئی پلکوں کے ساتھ حوا کے قریب جاتا ہے، حوّا کی آنکھیں معاً جھک جاتی ہیں، آدم حیرت واشتیاق سے دیوانہ ہو کر حوّا کو دیکھتا ہے، اسکی آنکھوں میں دل سا دھڑکتا معلوم ہوتا ہے، دیکھتے دیکھتے حوّا کے قریب دوزانو ہو کر سر جھکا دیتا ہے اور دونوں ہاتھ جوڑ لیتا ہے پھر سر اٹھاتا اور حوّا کے چہرے پر دو چبھتی ہوئی برچھیوں کی طرح نگاہیں جما دیتا ہے حوا اور آدم دونوں کے سروں اور پہاڑیوں کے دامنوں پر چھوٹے چھوٹے بچوں اور شہروں کے گھروں کا دھندلا سا پرتو کانپنے لگتا ہے، شاخیں دوبارہ جھومنے، کلیاں دوبارہ کھلنے اور طیور دوبارہ چہچہانے لگتے ہیں، اور پہاڑوں کی چوٹیوں پر جمی ہوئی برف آہستہ آہستہ پگھلنے لگتی ہے ؏۔

منظر (۱۲)

چودھویں رات کا چاند سمندر پر جگمگا رہا ہے، میٹھی اور ٹھنڈی چاندنی چھٹکی ہوئی ہے، موسم کے مزاج میں اعتدال اور ہواؤں میں خوشبو ہے اور آدم و حوّا ایک دوسرے کے ہاتھ میں ہاتھ ڈالے سمندر کے کنارے ٹہل ٹہل کر باتیں کر رہے ہیں :-

آدم

کس درجہ زندگی تھی پریشاں ترے بغیر

حوّا

سچ مچ یہ زندگی تھی پریشاں مرے بغیر؟

آدم

ہاں ہاں یہ زندگی تھی پریشاں ترے بغیر

یہ سُن کر حوّا خفیف سا مُتبسّم ہو کر کچھ سوچنے سی لگتی ہے، اور آدم اپنی رَد
میں دوبارہ کہتا ہے :-

پھیکا تھا رنگ لالہ و گُل دورِ ہجر میں
گونگے تھے طائران خوش الحان ترے بغیر
پڑتی تھی آہِ نرم سی شئے سی بھی اک خراش
حسّاس اسقدر تھی رگِ جاں ترے بغیر
چبھتی تھی پہلوؤں میں ستاروں کی روشنی
ڈستا تھا پرتوِ مہہ تاباں ترے بغیر
ہوتی تھی مس تو آنکھوں میں لگتی تھی بادِ سرد
کتنا سبک تھا دیدۂ حیراں ترے بغیر

کہ آدم و حوّا، دونوں سبزہ زار سے گذرتے ہوئے ایک سنگِ مرمر کے

ٹیلے کے قریب پہونچ جاتے ہیں، آدم سبزے پر سے بیلے کے پھول چننے لگتا ہے، اور حوا امرمریں ٹیلے پر چڑھ جاتی ہے اور چاندنی میں مرمر کا انعکاس حوا کے چہرے کو کچھ ایسا حسین طلسم بنا دیتا ہے کہ جیسے ہی آدم پھول چن کر اوپر نظر اٹھاتا ہے، پھول اس کے ہاتھ سے گر جاتے ہیں، اور حوا کی طرف آغوش وا کر کے وہ ایک عجیب ہیجان کے عالم میں کہنے لگتا ہے:۔

آدم کا پہلا ترانہ

اے نرگسِ جاناں یہ نظر کس کے لئے ہے
یہ شعلہ، یہ بجلی، یہ شرر کس کے لئے ہے

اے قامتِ بالا و بلند اے قدِ موزوں
یہ سرو، یہ شاخِ گلِ تر کس کے لئے ہے

شیریں و تلخ زہر رگ و پے میں بھر دیا
کس نے یہ مجھکو جسم سے آگاہ کر دیا
لگتا ہے تیر بن کے چھکنا ہزار کا
در آیا ہے بدن میں زمانہ بہار کا

اور پھر حوّا اپنے دونوں ہاتھوں کو زور زور سے جھٹک کر بہ آواز بلند کہنا شروع کرتی ہے۔

رہ رہ کے کوئی چیز مچلتی ہے کیا کروں
کوڑی کے پاس آگ سی جلتی ہے کیا کروں
سیال ہو رہی ہوں سنبھلتا نہیں بدن
معبود میری اوس کو پی لے کوئی کرن

کہ حوّا کے جسم کی برقی لہریں اور آواز کی متواج گرمی، آدم کے جسم اور کانوں میں

پلاٹینیم کی شعاعوں کی طرح یکایک نفوذ کرجاتی ہے، وہ گھبرا کر آنکھیں کھولتا ہے اور پھر بند کرلیتا ہے۔ پھر انگڑائی لیتا ہے، اس شدت سے گویا اس کی تمام رگیں ٹوٹ جائیں گی، اور انگڑائی کے واسطے پھیلے ہاتھوں کو جب اپنی طرف واپس لاتا ہے تو آغوش کشا میں حوا کا تمام وجودان کے اندر کھنچا چلا آتا ہے او دونوں کے تہہ و بالا سینے ایک دوسرے میں پیوست ہوکر رہ جاتے ہیں۔
سورج ڈوب جاتا ہے اور یکایک ابر کا ایک نہایت سیاہ لکہ تمام منظر کو اپنی گہری تاریکی میں گم کردیتا ہے۔

منظر (۱۴)

آدم و حوا جن کا رنگ سب دنوں سے زیادہ نکھرا ہوا ہے، ایک جھلکتے ہوئے دریا میں غسل کررہے ہیں اور ایک دوسرے پر پانی اچھال اور قہقہے مار مار کر چہلیں کررہے ہیں کہ ہوا میں ایک سناٹا سا پیدا ہوتا ہے۔ دونوں کی دُھلی ہوئی آنکھیں آسمان کی جانب اٹھ جاتی ہیں، اور کیا دیکھتے ہیں کہ ایک عجیب ساخت کی چیز جسے تخت کہہ سکتے ہیں ہوا میں آہستہ آہستہ اڑتی ہوئی ان کے سروں پر ہوکر گزرنے والی ہے، تخت میں پھولوں کی شکلوں کے انگاروں کی جھالر ٹنکی ہوئی ہے اور تخت کے اوپر انہی عجیب الہیئت ذریات کے ساتھ ایک آتشیں پیکر بیٹھا ہوا ہے؛

جس کی لانبی ڈاڑھی تخت کے پیچھے اُڑ رہی ہے، اور وہ ایک عجیب طنز آمیز ترنم کے ساتھ آسمان کی طرف نگاہیں اٹھائے ہوئے کہہ رہا ہے۔

خود کو گم کردہ راہ کر کے چھوڑا
حوّا کو بھی تباہ کر کے چھوڑا
کیا کیا نہ کئے حضورِ والا نے جتن
آدم نے مگر گناہ کر کے چھوڑا

قہ — قہ — قہ — قہ — قہ — قہ

اس آواز سے آدم و حوا بدحواس ہو جاتے ہیں، چہروں پر ہوائیاں سی اڑنے لگتی ہیں، اور دونوں دریا سے نکل کر بھاگتے اور ایک غار میں چھپ جاتے ہیں ——— اور نگاہوں سے اوجھل ہوتے ہوئے تخت سے دوبارہ آواز گونجتی ہے۔

میری فتحِ اوّلیں کو نوٹ کرلے آسماں
ہاں جلا جل کو بجائیں کس طرف ہیں آندھیاں

کہ یکایک آندھیوں پر آندھیاں آنے لگتی ہیں، تمام دنیا شور اور تاریکی میں گم ہوجاتی ہے، بڑے بڑے تناور درخت فضا پر اڑتے نظر آتے ہیں اور جلاجل کی لگاتار آوازوں سے آسمان کی ڈاٹ تھرتھرانے لگتی ہے۔

منظر (۱۵)

قُربِ آدم وحوّا کے ایک طویل زمانے کے بعد

صُبح کا وقت اور بہار کا موسم ہے۔ آدم وحوّا جن کے چہروں پر اب تجربہ کاری کے آثار پائے جاتے تھے فضائے آسمانی میں ایک معلق تختِ جواہر پر بیٹھے، جو پھولوں سے لدا ہوا ہے، اپنی تمدن یافتہ نسل کا تماشہ دیکھ رہے ہیں:-

حوّا آدم کی طرف دیکھکر

آفریں جوشِ حیات مرحبا زورِ نمو

یہ مرے بچّے ہیں، میری نسل ہے، میرا لہو
اپنے بچّے زندگی کے یوں ترانے گائیں گے
کون کہہ سکتا تھا ہم اتنے عدد بنجائیں گے
آسمانِ زندگانی کے مہ و پروین ہیں یہ
کتنے پیارے، کتنے بھولے، کسقدر شیریں ہیں یہ
بچپنا ہے کسقدر رفتار میں، گفتار میں
جی میں آتا ہے کہ رکھ لوں اس کلیجے میں انھیں
اے میں قرباں پھر رہے ہو کس قدر بیگانہ وار
آؤ آؤ اس طرف تو آؤ ماں تم پہ نثار

آؤ آؤ مثلِ بادِ نو بہاری آؤ آؤ

آؤ بچو آؤ میں ہوں ماں تمھاری آؤ آؤ

آدم

یہ بلانے کی صدائیں کس قدر بے سود ہیں

جب کہ حوا خود یہ تیری ذات میں موجود ہیں

آج جو یہ شکلِ انساں میں دکھاتا ہے بہار

یہ تری اِن نرگسی آنکھوں کا ہے رنگِ خمار

ان کی شیریں زندگانی، زندگانی ہے تری

یہ تمنا ہے تری، یہ نوجوانی ہے تری

یہ جو چہروں پر نظر آتی ہے اک شیریں پھبن
یہ ترے مکھڑے کی رنگیں جوت ہے اے سیم تن
رکھ رہے ہیں، یہ جو اٹھلا کر ترے بچے قدم
درحقیقت یہ تری آواز کا ہے زیروبم
بازوؤں پہ یہ جو زلفیں اڑ رہی ہیں تا بدار
یہ تری مہکی ہوئی سانسیں ہیں اے جانِ بہار
یہ اُدھر جو جا رہی ہیں دخترانِ تازہ دم
یہ اسی وادی کی کلیاں ہیں جہاں چٹکے تھے ہم
یہ جو میٹھے زمزموں سے گنگناتی ہے زمیں
سنسناہٹ یہ ترے سینے کی ہے اور کچھ نہیں

خاک پر مچلی ہوئی ہے یہ جو اک موجِ شباب
یہ ترے ہونٹوں کا رس ہے تیری آنکھوں کی شراب
یہ جو جنبش سی نظر آتی ہے تجھ کو دور تک
میری نبضوں کی دھمک ہے تیری پلکوں کی جھپک
یہ جو دو آنکھوں میں لہریں دو دلوں میں میل ہے
یہ وہی کھیلا ہوا اپنا پرانا کھیل ہے
زندہ و پائندہ و رخشندہ و تابندہ باد
نسلِ آدم زندہ باد و نسلِ حوّا زندہ باد

کہ اتنے میں دریچۂ عرش کے کھلنے کی گھڑگھڑاہٹ، ہواؤں پر محیط ہو جاتی ہے
خدا دریچۂ عرش میں نمودار ہو کر، کرۂ عرض پر نگاہ ڈالتا ہے، اور خوشی و مسرت
سے کہنا شروع کرتا ہے:۔

اے سنبل و نسریں کے لئے پیکِ ہزیمت

پیغامبرِ فتح و ظفر کس کے لئے ہے

اے سایۂ کاکُل میں جھمکتے ہوئے چہرے

یہ شام کے حلقے میں سحر کس کے لئے ہے

اے مرمرِ مہتاب سے دمکے ہوئے مکھڑے

تجھ پر یہ تبسّم کا اثر کس کے لئے ہے

اس پیکرِ شفاف کے گرد اے مہِ تاباں

دھنکی ہوئی یہ تابِ گُہر کس کے لئے ہے

اے دخترکِ شبنم و پروردۂ نرگس

یہ تاب یہ دزدیدہ نظر کس کے لئے ہے

اے خود سے الجھتی ہوئی سرشار جوانی

ہر سانس میں یوں زیر و زبر کس کیلئے ہے

کہ حوّا آنکھوں کو جھکا، اور انگلیوں کو مروڑ کر جواب دیتی ہے:-

یہ کچھ نہیں معلوم، مگر تجھ سے سنوں گی!

~~یہ بات کہ تو خاک بسر کس کے لئے~~

کہ یکایک ایک آتشیں پیکر کا دھندلا سا سراپا ایک سیاہ ابر پارے کو نقاب بنائے ہوئے فضا میں اڑتا ہوا نظر آتا ہے، اور آدم کے سر کے قریب آکر کہتا ہے:-

ہر سانس میں یہ زیر و زبر تیرے لئے ہے

ناداں! یہ ممنوع شجر تیرے لئے ہے

آدم و حوّا اس آواز سے گھبرا جاتے ہیں، حوّا پہاڑی سے دوڑتی ہوئی آتی

ہے اور آدم سے چمٹ جاتی ہے۔ آدم کی چھاتی سے آگ نکلنے لگتی ہے۔

منظر (۱۳)

تیسرا پہر ایک کنج کے سبزے پر حوّا بیٹھی ہوئی ہے، اور آدم اُس کے زانو پر سر رکھے سو رہا ہے کہ ایک سُرخ پوش چہرے پر گہری سیاہ نقاب ڈالے جھاڑیوں سے دبے قدموں نکلتا ہے اور حوّا کے سامنے آکر کھڑا ہو جاتا ہے حوّا اسے دیکھتے ہی سہم سی جاتی ہے، یہ دیکھتے ہی سُرخ پوش کچھ جادو کے کلمات ادا کر کے حوّا کی جانب بائیں اُنگلی اُٹھا کر خاموش رہنے کا اشارہ کرتا ہے، جس سے حوّا کی حیرت تو باقی رہتی ہے، مگر خوف کم ہو جاتا ہے، اور موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے سُرخ پوش حوّا سے نہایت ہی دھیمی اور انتہائی ترغیب آمیز آواز میں کہنا شروع کرتا ہے۔

سُرخ پوش کی ترغیب

اِس آبِ تبسّم میں نہ آئے گی روانی
اِس حرف سے چھلکے ہیں، نہ جھلکیں گے معانی

اس حسن سے ہو گی نہ کبھی شعلہ فشانی
برسے گا نہ اک بوند بھی اس ابر سے پانی
ناداں اگر تو نے مری بات نہ مانی

اس سلسلۂ شرم سے بل جائے گا جس وقت
رگ رگ میں جواں خون ابل جائیگا جس وقت
سانچے میں نئی آگ کے ڈھل جائے گا جس وقت
کانٹا ترے سینے سے نکل جائے گا جس وقت
کھل جائیں گے تخلیق کے اسرارِ نہانی

ہاں جھوم کہ انگارہ جوانی کا دہک جائے
کوندا سا لپکنے لگے، بجلی سی چمک جائے

یوں پی مئے عشرت کہ ترا جسم چھلک جائے
اور اتنی کہ انگڑائی جو لے جلد مسک جائے

اٹھ رقص میں آ رقص میں بھر پور جوانی

اِس شرم سے، اِس ضبط سے، اِس بیم و رجا سے
اس جذبۂ ناموس سے، اس خوف خدا سے
اس شدتِ آداب سے، اس فرطِ حیا سے
اس خِفّت و معزولی انداز و ادا سے

تنہا ئیں ہی سلونی ہیں، نہ صُبحیں ہی سُہانی

یہ کہتے ہی سُرخ پوشش اپنے دونوں بازوؤں کو اٹھا لیتا ہے، سیاہ ابر کے دو ٹکڑے اس کے بازوؤں کے نیچے آجاتے ہیں، اور وہ فضائے نیلگوں میں پرواز کرتا ہوا نگاہوں سے اوجھل ہو جاتا ہے، خوابِ چند لمحوں کے لئے دم بخود ہو کر بیٹھ جاتی ہے

لیکن حیرت زدگی کی یہ کیفیت اس کے خون کی یکایک غیر معمولی گردش اور اس کے اعضاء کی تکلیف دہ حد تک فوری کشمکش کے اندر گم اور باطل ہو جاتی ہے، اور وہ اپنی کلائیوں اور بازوؤں کو دیکھ کر دل ہی دل میں کہنے لگتی ہے :-

بازو یہ نرم نرم یہ گوری کلائیاں

یہ تن بدن میں آنچ کی لہریں رواں دواں

بیداریوں کو اپنے جلو میں لئے ہوئے

کیسی یہ نیند سی ہے احاطہ کئے ہوئے

آنکھوں سے ایک بھاپ سی اٹھتی ہے گرم گرم

پنڈے کے بھیکے پن میں ہے کیسے مزے کا درد

تڑپا رہا ہے کون دلِ دردمند کو

اینٹھن سی کھائے جاتی ہے ہر جوڑ بند کو

رگ رگ میں خون لیتا ہے تھم تھم کے چٹکیاں
رُخ سے لٹوں کو چھوتے ہی اُٹھتا ہے اک دھواں
کوئی ٹھمک رہا ہے بہ اندازِ دل نشیں
سینے میں ہے کہ گود میں مجھ کو خبر نہیں
کانوں سے لو نکلتی ہے اور آگ ہے جبیں
چھاتی اُبل رہی ہے نہ ہو جائے شق کہیں
زانو پہ سونے والے ہی سے کیوں نہ پوچھ لوں
یہ بے خودی سی مجھ پہ چھٹی پڑ رہی ہے کیوں
دُھومیں مچی ہوئی ہیں وہ دل ہیں کہ الاماں
اینٹھی سی جا رہی ہیں نگوڑی کلائیاں

اک پو سی پھٹ رہی ہے ابھتی نجوم سے
کیا صبح ہو رہی ہے رگ و پے میں دھوم سے
ہوتی ہے کیوں لچک سی کمر میں یہ بار بار
کیسا ہے اُف یہ دھوم مچاتا ہوا اُبھار

پیدا ہوئی ہے بات یہ شاید بہت بری
پہلو سے زلف مَس ہو تو آتی ہے جھرجھری
تیزی سی بن رہی ہوں ہیں اک زندہ پھول بن
ہاتھوں سے نکلا جاتا ہے پھبکا ہوا بدن
ہر رو نگٹے کی جاگ اُٹھی پیاس الاماں
احساس اور جسم کا احساس الاماں

مرحبا اے نوعِ انساں مرحبا، صد مرحبا
یہ تجلّی، یہ ترنم، یہ تبسّم، یہ ضیا

یہ چمن، یہ کھیت، یہ تالاب، یہ نہریں، یہ بند
یہ کلس رنگین و زر افشاں منارے یہ بلند

یہ محل یہ طاق یہ گنبد، یہ فوّارے، یہ باغ
یہ اُجالے کے دریچے، یہ اندھیرے کے چراغ

یہ خروشِ مطرباں، یہ نغمۂ چنگ و رباب
یہ ہجومِ رنگ و روغن یہ وفورِ آب و تاب

یہ قبائیں، یہ جواہر، یہ نوادر، یہ بخور
موجِ آب و موجِ رنگ و موجِ عود و موجِ نور

کون کہہ سکتا تھا وحشت کی بلا ٹل جائے گی
ضَوفگن چہروں کی سانچے میں زمیں ڈھل جائے گی

کہ اتنے میں خدا کیا دیکھتا ہے کہ حوّا، آدم سے پُوچھ رہی ہے:-

حوّا

کون ہیں یہ بزرگوار اُوپر

آدم

اِن کو دیکھا تو تھا کبھی میں نے

یہ تماشا دیکھ کر خدا کے دل پر ایک چوٹ سی لگتی ہے اور غمگین آواز میں کہتا ہے:-

ان کا ہے جو مادی بھول گئے، ان کا جو ہے ملجا بھول گئے
افسوس کہ اپنے خالق کو یہ آدم و حوّا بھول گئے

اور پھر سر جھکا کر غمگین چہرے کے ساتھ کچھ سوچنے لگتا ہے، سر جھک جاتا ہے
اور سوچتا رہتا ہے اور پھر آہستہ سے زیر لب کہتا ہے:-

زندگی ہے پوچ، عرفانِ حقیقت کے بغیر
یہ ورق تاریک ہے مُہرِ نبوت کے بغیر

یہ کہکر ایک لمحے کے واسطے خاموش ہو جاتا ہے، اور پھر ایک خاص خلّاقانہ
ذہانت کے ساتھ اپنی تابناک آنکھوں کو گردش دے کر ایک خاص ولولے کے
انداز میں آواز دیتا ہے:-

اے سحر دامن چھپا لے اِس اندھیری رات سے
اے زمیں رخشندہ ہو جا مشعلِ آیات سے

ہاں چمک، برقِ ہدایت، ہاں برس ابرِ کرم
جاگ اے روحانیت، کُھل اے رسالت کے علم

رُباعیات

اِس خاک میں خوابیدہ ہے رُوحِ عَظَمَت
اِس گور میں دفن ہے سُخن کی دولت
دُزدیدہ نفس آ، کہ ہے یہ مرقدِ پاک
آرام گہِ جوشؔ علیہ الرّحمتہ

دانائے رُموزِ این و آں ہُوں اے دوست
مولائے اکابرِ جہاں ہُوں اے دوست
کیوں اہلِ نظر پڑھیں نہ میرا کلمہ
میں شاعرِ آخر الزّماں ہُوں اے دوست

ہر بار اُبھار کر ڈبوتا ہے مجھے
پا، پا کے نہ جانے کون کھوتا ہے مجھے
روتا تھا تو دل کو پہلے ہوتی تھی خوشی
ہنستا ہوں تو اب ملال ہوتا ہے مجھے

اللہ رے جور ہائے عُمرِ گزراں
کیا جانئے دل کہاں سے پہونچا ہے کہاں
کل کوہِ گراں بھی تھا بس اک پرتوِ کاہ
اب پرتوِ کاہ بھی ہے اک کوہِ گراں

اے تو کہ ہے تیغِ خود پرستی کا غلاف
ہر چند ترا انور ہے صاف و شفاف
رقصِ پروانہ پر نہ اِترا اے شمع
یہ اپنی ہی ذات کا ہے در اصل طواف

غیبت[1] ہو خرابات کے اندر، یہ کیا!
تو تل سے کھلے کذب کا دفتر، یہ کیا!!
اربابِ نظر، بساطِ پاکِ مے پر
گردش میں ہو بہتان کا ساغر یہ کیا!!!

[1]: مسجدیں تو بے چاری بدنام تھیں، اب میکدے بھی ذلیل ہو رہے ہیں، وہ میکدے جہاں راست بازی راست گفتاری اور طہارتِ قلب کا کلمہ پڑھا جاتا ہے، برہماں کبار فاعتبروا یا اولی الابصار۔

ہر شخص ہے بدحواس، کس سے پوچھوں
ہر قلب ہے غرقِ یاس، کس سے پوچھوں
کچھ روز سے اس محفلِ آب و گِل میں
ہر چیز ہے کیوں اُداس، کس سے پوچھوں

بستی ہی نہیں، عیش کی بستی کے سوا
عالم ہی نہیں، عالمِ مستی کے سوا
ایثار و کرم ہی نہیں، قربانی تک
کچھ بھی نہیں، ذوقِ خود پرستی کے سوا

ہر زہر کو مثلِ بادہ پی سکتے ہیں
ہر چاک کو مسکرا کے سی سکتے ہیں
یا احمقِ بے پناہ، یا مردِ حکیم
یہ دو ہی خوشی کے ساتھ جی سکتے ہیں

سرمستی و سبزہ زار بھی ہے تو کیا
چنگ و چمن و چنار بھی ہے تو کیا
باران و بہار و بادہ کے دوش بدوش
پہلو میں اگر نگار بھی ہے تو کیا

اب کون کرے گا میزبانی میری
مُرجھائی پڑی ہے زندگانی میری
معلوم نہیں کہ اُن کو لے کر ہمراہ
کس دیس چلی گئی جوانی میری

رُوٹھی جیسے ہی مجھ سے لیلائے شباب
پہلو سے مرے اٹھی وہ سلمائے شباب
میرے رُخِ تیز رو سے باتیں کرتی
کیا جانے کِدھر نکل گئی ــــ ہائے شباب!

بھاتا ہی نہیں کوئی تماشا ہم کو
دُنیا ہی پسند ہے، نہ عُقبیٰ ہم کو
کہتے ہیں جسے دَولتِ قُربِ جاناں
اُس شئے کی بھی اب نہیں تمنّا ہم کو

ظُلمت ہی نہیں، نورِ شبستاں بھی ہے بار
کیا خارِ مُغیلاں، گُلِ خنداں بھی ہے بار
ہُوں اتنا تھکا ہوا کہ میرے دل پر
مَوجِ نفس و جُنبشِ مژگاں بھی ہے بار

ہوتی ہے جب آخرت کی دہشت پیدا
کرتی ہے پیمبری شریعت پیدا
اور قیدِ شریعت سے فرارِ صوفی
کرتا ہے قلوب میں طریقت پیدا

ہنس سکتا ہے صرف، رو نہیں سکتا ہے
پا تو سکتا ہے، کھو نہیں سکتا ہے
اک سمت ہی جذبوں کے بہانے والو!
انسان مشین ہو نہیں سکتا ہے

زُلفوں کو ہٹا کے کُنمُنایا کوئی
فرشِ مخمل پہ رسمسایا کوئی
جیسے کندن پہ موجِ عکسِ مہتاب
یوں چونک کے صبح مُسکرایا کوئی

اے پھول صبا ہمیشہ مہکائے تجھے
اے چاند کبھی گھٹا نہ سنولائے تجھے

*

اس نیند بھرے لوچ سے لِللہ نہ چل
ڈرتا ہوں کہیں نظر نہ لگ جائے تجھے

زُلفوں کی مہک ہے نرم جھونکوں کی سنک
مُڑتی ہوئی کشتی میں ہے شیشوں کی کھنک
واللہ کہ میں بندہ نہیں ہوں اسوقت
پہلو میں ہے اک زہرہ جبیں سر پہ دھنک

اِترا کے مرے حضور گردن نہ اُٹھاؤ
یہ بارگہہ بلند ہے ہوش میں آؤ!
الوند و ہمالہ و اُحد ہو تو کیا
کیوں سامنے اپنے قد و آور ہو جاؤ

تا اہلِ نظر قبر پہ موتی برسائیں
خوبانِ صبیح و لالہ رُخ پھول چڑھائیں
کہتا ہے مرا وطن کہ از راہِ کرم
حضرت اب انتقال فرما جائیں

آیا وہ انقلاب آیا جاگو!
فرمانِ شکستِ خواب آیا جاگو
اے ہند کے بدنصیب سونے والو
سر پر وہ آفتاب آیا جاگو

صد دیر و حرم کنشت خُم پر قرباں
صد باغِ ارم بہشت خُم پر قرباں
صد پرچم و اورنگ و عصا و دیہیم
یک ذرّہ پاک خشتِ خُم پر قرباں

پھر پائی نہ دادِ جاں نثاری میں نے
کی پچھلے پہر پھر اشکباری میں نے
اے سخت کمان و سست پیماں فریاد
یہ رات بھی آنکھوں میں گذاری میں نے

پیمانِ وفا نبا سکتا ہے کوئی ؟
فرقت میں تری کراہ سکتا ہے کوئی ؟
اِس منزلِ زندگی میں ظالم تجھ کو !
بندے سے زیادہ چاہ سکتا ہے کوئی ؟

اُس سمت ہے معتوب و ذلیل و مردود
اِس سمت ہے آدمی عزیز و محمود
یہ مذہب و ارتقاء کے مابین ہے فرق
انساں کا وہ ہبوط ہے، اور یہ صعود

خود بڑھ کے گراتا ہے اٹھانے والا
جی بھر کے رُلاتا ہے ہنسانے والا
میں جوش ہوں، ہمنشیں، وہ روٹھا ہوا جوش
اب کوئی نہیں جس کا منانے والا

تم تو ملکہ ہو، فخر و نازِ عالم
کیوں تم کو ہو اک گدائے بے قدر کا غم
یوں دل نے بھلا دیا ہے خودداری کو
کھا سکتی ہو میری بے حیائی کی قسم

مہ پارہ و مہ رُخ و مُنوّر تُم ہو
میری نظروں میں سب سے بہتر تُم ہو
اوروں کا جمال ہے مری پاؤں کی پھانس
جو دل میں ہے پیوست وہ خنجر تم ہو

دیتا نہیں باغباں سہارا مجھ کو
کرتی نہیں بُلبُل بھی اشارا مجھ کو
مُرجھائے ہوئے پھول نے حسرت سے کہا
اب توڑ کے پھینک دو خدارا مجھ کو

بہتر تھا فریب کا نہ جادو ہوتا
عشووں کے عوض درد کا پہلو ہوتا
ہونٹوں پہ ان امواجِ تبسم کے عوض
آنکھوں میں تری کاش اک آنسو ہوتا

راحت کی تمام دن نکالیں راہیں
تا شب کو وہ مل جائے جو کچھ ہم چاہیں
جب ہار خوشی کا گندھ گیا تو دیکھا
گردن میں پڑی ہوئی ہیں غم کی باہیں

اے میرے حریفِ کفر و اے حامیٔ دیں
قربان ہیں صحیفۂ روئے مبیں
سجدے کا مرے ترا خدا ہے طالب
اب بھی آئے گی مجھ سے ملنے کہ نہیں

اے کعبۂ ذوقِ دید، واے دیرِ نگاہ
اے راہزنِ انجم و غارت گرِ ماہ
کیا تیرہ شبی کا اس مسافر کو ہو خوف
تیرے مکھڑے کی لو ہے جس کے ہمراہ

کس ناز سے گلشن میں ٹہلتی ہوئی آئی
سانچے میں شگفتگی کے ڈھلتی ہوئی آئی
کلیوں کی گرہ کھل گئی جب وہ دمِ صبح
آنکھوں کو ہتھیلیوں سے ملتی ہوئی آئی

تابِ زر و سیم حسنِ بُتاں پہ نثار
رنگینیٔ صبح روئے خوباں پہ نثار
صد جامۂ زہد، و صد قبائے سلطاں
آزاد کے اک چاک گریباں پہ نثار

سر میں ہے ہزار بار حسرت کی کھٹک
سینے میں بے شمار چھالوں کی تپک
گر پڑتا میں چکرا کے سرِ راہِ حیات
دل میں اگر اس زُلف کی ہوتی نہ مہک

ہم پیشہ و ہم راز سے لڑ بیٹھتے ہیں
دل پرور و دمساز سے لڑ بیٹھتے ہیں
اللہ و شہنشاہ کا کیا ذکر اے جوشؔ
ہم دلبرِ طنّاز سے لڑ بیٹھتے ہیں

غم سے مانوس ہو کے بھی دیکھ لیا
ٹھنڈا فانوس ہو کے بھی دیکھ لیا
دل میں مر مر کے زندہ ہوتی ہے امید
قطعاً مایوس ہو کے بھی دیکھ لیا

پرتو کو ترے جگائے رکھتا ہوں
پلکوں میں کنول جلائے رکھتا ہوں
اس ڈر سے کوئی دیکھ لے تجھ کو نہ کہیں
اپنی آنکھیں جھکائے رکھتا ہوں

شمشیرِ فساد کو روانی سے نہ روک
انساں کو تعصّب و سرگرانی سے نہ روک
غسلِ صحّت کا ہے یہ ساز و ساماں
اقوام کو خوں نابہ فشانی سے نہ روک

بیدار، کہ ہے وقتِ ترنّم ساقی
پھر جام میں بھر رُوحِ تلاطم ساقی
ٹھہرے ہوئے آنسو کے اُفق سے ہاں دیکھ
طالع وہ ہوئی صبحِ تبسّم ساقی

"اِک آن ٹھہر، ہوش میں پھر آتی ہوں"
"پل بھر میں نظر پہ رنگ برساتی ہوں"
"ہے ہے مُرجھا گئی گُل اندام کلی"
"کیوں کُڑھتا ہے، لے پھُول بنی جاتی ہوں"

ہر قید سے ہر بند سے آزاد رہو
رہتی دُنیا تلک تم آباد رہو
اُڑتی ہوئی شبنم نے شگوفوں سے کہا
لو، میں تو چلی، شگفتہ و شاد رہو

ہر وقتِ سکوں کو اذنِ عشرت جانو
ہر نیم نفس کو ایک دولت جانو
مستقبل و ماضی میں اب الجھنے والو
اس لمحۂ نقد کو غنیمت جانو

اب رعبِ جمال مجھکو آزار نہ دے
ہاں مرد ہے وہ، جان کی بازی جو بدے
لو وہ کوئی آ گیا بر افگندہ نقاب
اے جراتِ یک نظر، خدا را مدد دے

اللہ رے جبرِ ہم نشینانِ کبار
سب کی نظریں، مری نظر سے ہیں دوچار
ہر چند کہ ہے پیشِ نظر مُصحفِ دوست
پھر بھی نہیں آنکھوں کو مجالِ دیدار

پارے کی طرح چڑھ کے اُترنے والی
اے سایۂ جوش سے بھی ڈرنے والی
تجھ سے نہ گُریزاں ہو کبھی حُسنِ شباب
صُحبت سے مری گریز کرنے والی

ہر صُبح کے بعد، شام ہے آخرِ کار
ہر شبنم و گُل ہے منزلِ برق و شرار
ہر خوابِ شباب میں ہے بیداریٔ شَیب
فریاد ہے، اے عَرَبدۂ لَیل و نَہار

اے یادِ شباب دل ہے زار و پامال
افسوس محبت کا یہ ہونا تھا مآل
اک شہر میں بھی رہ کے جُدائی، صد حیف!
اک بزم میں بھی بیٹھ کے محرومِ جمال

ہاں آبِ حیات پی نہیں سکتے ہیں
دامن کا شگاف سی نہیں سکتے ہیں
اے رُوحِ شرافت، ترے بل پر ہم لوگ
مر تو سکتے ہیں، جی نہیں سکتے ہیں

ایمان کے کانٹوں سے اُبھاریں گے تجھے
وجدان کے پھولوں سے سنواریں گے تجھے
تا چند بہشت و حُور و انگور و قصور
مَے پی کہ یہ سب خود ہی پکاریں گے تجھے

معبود! جیتے جاگتے سوتے گزری
ہر شام و سحر جی سے گزرتے گزری
اُس عُمر کا بھی حساب لیگا سرِ حشر
جو عُمر کہ ہائے ہائے کرتے گزری

جلتے دل کو ٹٹول دھیرے دھیرے
اگنی مندر کو کھول دھیرے دھیرے
برہا میں برس رہی ہے پاپی برکھا
کلموئی کوئلیا، بول دھیرے دھیرے

اے اخترِ خوش جمال وے ماہِ جمیل
اے تو کہ ترا نظیر کوئی نہ عدیل
جتنا کہ حقیر کر چکی ہے اب تک
بندی کو اب اس سے بڑھ کے کرنا نہ ذلیل

کونین کی ہر آگ کو کجلاتا ہے
آفاق کے ہر نور کو دھندلاتا ہے
"مہتاب میں دھبے ہیں گلوں میں کانٹے"
بدبیں کو بس اتنا ہی نظر آتا ہے

پھر تازہ فسادِ مے کے اوقات میں ہے
پھر سازشِ نو اہلِ خرابات میں ہے
سرمایۂ صد داغِ جگر ہے اے جوشؔ
وہ رخنہ کہ دیوارِ خرابات میں ہے

پہنا کے وفا نے آگ مالا ہم کو
سانچے میں نئے سوز کے ڈھالا ہم کو
اپنا ہی نہیں، دل میں ہے دشمن کا بھی درد
اس چیز نے اور مار ڈالا ہم کو

زُلفِ حرماں سنوارتا ہے کوئی
نقشِ ہجراں اُبھارتا ہے کوئی
جنگل جب جھُٹ پُٹے میں ہوتا ہے اُداس
تھم تھم کے مجھے پُکارتا ہے کوئی

اللہ رے اے عربدۂ لیل و نہار
ہر دور میں دل پہ غم کا رہتا ہے غبار
جب تُو مختار تھی تو میں تھا مجبُور
جب تو مجبُور ہے تو میں ہُوں مختار

ہستی، فقط اک چلت پھرت ہے، ساقی
اک موج، اک ناچ، اک برت ہے، ساقی
گردش میں رہے جام کہ دورِ عالم
بس ایک مسلسل حرکت ہے، ساقی

سو جا، اے قلبِ زار و مضطر، سو جا
وہ وعدہ فراموش ہے ستمگر، سو جا
ہاں رات گئے کسی نے دستک دی ہے
میرے نہیں، ہمسایہ کے در پر، سو جا

اک غلغلہ ہے رُوح پہ غالب اے جوؔش
طوفاں میں ہے بشر کا قالب اے جوؔش
اپنے مطلوب سے نہیں جو آگاہ
انساں ہے وہ عجیب طالب اے جوؔش

کعبے سے، کبھی دیر سے یاری دیکھی
بُت کی تو کبھی خدا کی باری دیکھی
مطلوب کو اک نفس کا دھوکا پایا
دیکھی تو طلب ہیں پائیداری دیکھی

ہے عرش سے تا فرش پریشاں حالی
یوں دل کی محبت میں ہوئی پامالی
آباد تھا یا تو ذرّہ ذرّہ، یا اب
ہر شے نظر آ رہی ہے خالی خالی

ارمان ہے وہ دھوپ کہ ڈھلتی ہی نہیں
حسرت وہ شے ہے جو نکلتی ہی نہیں
مطلوب تو ہر روز بدل جاتے ہیں
کمبخت طلب ہے کہ بدلتی ہی نہیں

ہر سانس میں جامِ زہر پیتا کیوں ہے
ہر چاک کو بار بار سیتا کیوں ہے
جتنے بھی جتن ہیں، سب ہیں جینے کے لئے
پَر یہ بھی کبھی سوچ کہ جیتا کیوں ہے

اُس سانولی مُطربہ کی اللہ ری آن
گھُل جاتی ہے چہرے کے نمک میں ہر تان
یُوں نغمہ دمک اُٹھتا ہے اُس کے رُخ پر
جس طرح کہ سونے کا کسوٹی پہ نِشان

جب صُبح کو ہوتا ہے جواں عالمِ پیر
ہلتی ہے صبا سے میکدے کی زنجیر
شاخوں کے لچکتے ہی مرے سینے پر
رگ ہائے گُلِ تر سے برس پڑتے ہیں تیر

کل صُبح کو جب رقص میں تھا رنگ و شباب
نظریں تھیں چمن کی تازگی سے شاداب
پُھولوں کی طرف مُڑا تو کانٹوں نے کہا
اے آبلہ پا شاعرِ گُل چیں، آداب

اُف خنجرِ آبدار سے دل کو نہ چھیڑ
دُزدیدہ نظر کے تار سے دل کو نہ چھیڑ
لہجے کا یہ کاٹ اور یہ آواز کی باڑھ
ہیرے کی چھُری کی دھار سے دل کو نہ چھیڑ

کل رات کو آتے ہی وہ شیریں حرکات
کہنے لگی اے شاعرِ طوفانِ حیات
بس آخری بار آج آئی ہوں یہاں
کل بھی آؤں گی صرف کہنے یہی بات

قہّار، یہ لُطف !! پھر خفا ہے مجھ سے ؟
یا پھر کوئی تازہ دغدغا ہے مجھ سے ؟
وہ دیکھ کے مجھکو مُسکرائی ہیں پھر آج
کیا کوئی قصُور پھر ہوا ہے مجھ سے ؟

طوفان کا زور تھم گیا تھا اے جان
گرداب سے پیچ وخم گیا تھا اے جان
اللہ رِی فسُردگی طُولِ فرقت
ارمان کا خُون جم گیا تھا اے جان

پھر سوز کی طرح ڈال دی ہے تُو نے
پھر عشق کی موت ٹال دی ہے تُو نے
جو اوس کہ پڑ چکی تھی میرے دل پہ
اُس اوس سے لَو نکال دی ہے تُو نے

کہتی ہو طبیعت اب اُبھرتی ہی نہیں
اب کاکُلِ آرزو سنورتی ہی نہیں
قانون نہیں، یہ عاشقی ہے کہ جہاں
درخواست کی میعاد گزرتی ہی نہیں

ممکن ہے یہ بے دلی، یہ حسرت نہ رہے
شاید مجھے مرنے کی ضرورت نہ رہے
کیا حرج ہے، ایک بار کوشش تو کرو
صرف اتنی کہ تم کو مجھ سے نفرت نہ رہے

ہر آہ میں اک مٹھاس ہے ذوق نواز
ہر گیت میں اک سُرور ہے ولولہ ساز
وہ مجلسِ غم ہو کہ شبستانِ طرب
دونوں میں ہے ایک بانسری کی آواز

میں مذہب وارتقا، پہ گر بحث کروں
تو مختصر الفاظ میں اتنا ہی کہوں
گردوں سے وہ اُفتاد ہے گیتی کی طرف
گیتی سے یہ پرواز ہے سُوئے گردوں

ہلکی کرنوں، سُبک ہواؤں میں ہے جنگ
گردوں پہ ہے آویزشِ صد شیشہ و سنگ
یُوں قوسِ قُزَح میں کشمکش ہے جیسے
انگڑائی کے ٹوٹنے کا رخسار پہ رنگ

اگلی سی نہ کر خیر محبّت ساقی
لیکن اک چیز ہے مروّت ساقی
بوتل ہے بغل میں ہر ہی پائے خُم پر
دیدے اک گھونٹ کی اجازت ساقی

میرے کمرے کی چھت پہ ہے اُس کا مکان
جلوے کا نہیں ہے پھر بھی کوئی امکان
گویا میں ہوں ندیم، اِک ایسا مزدور
جو بھوک میں ہے سر پہ اٹھائے ہوئے خوان

یہ جنگ سزاو قہر و ادبار نہیں
پیغامِ شفا ہے، پیکِ آزار نہیں
کھا اس کو پئے قوّتِ عصرِ حاضر
یہ تو موسم کا پھل ہے، تلوار نہیں

انساں جینے کو مر رہا ہے، اے دل
غوطے کھا کر اُبھر رہا ہے، اے دل
روتا ہے کہ تہذیب مٹی جاتی ہے
وحشت کا یہ خول اُتر رہا ہے، اے دل

یہ شیشہ رَصَدگاہ کا ہے، سنگ نہیں
پھُولوں کا ہے، لہُو کا یہ رنگ نہیں
سرِ منزلِ صُلحِ دائمی کی جانب
یہ جادۂ ناگُزیر ہے، جنگ نہیں

جو شہر ہوں سے ہو رہے ہیں برباد
ہو جائیں گے اس سے بڑھ کر اک دن آباد
گرتا ہے تو ہر مکاں یہ دیتا ہے صدا
لے رنگ محل کی پڑ رہی ہے بنیاد

اِک دل بھی نہیں رہیگا گندا، اے دوست
کُھل جائیگا ہر گلے کا پھندا، اے دوست
اِس جنگِ عظیم کے شدائد پہ نہ جا
لکڑی پہ یہ چل رہا ہے رُندا، اے دوست

غم، وقتِ خوشی بھی دل کو تڑپاتا ہے
گھٹنے کے عوض، اور بھی بڑھ جاتا ہے
دم بھر میں وہ آنے کو ہیں اِک عُمر کے بعد
اور دل ہے کہ کمبخت بھرا آتا ہے

آفاق کو کر لیگا مسخّر، اے دوست
اَسرار کی کھینچ لیگا چادر، اے دوست
شادی کے بغیر کوئی چارہ ہی نہیں
قُدرت تو ہے انساں کی مُنگیتر، اے دوست

بر میں شمس و قمر کا جاما ہو گا
سَر پہ نجم و گُہر کا سہرا ہو گا
آگے ہو گا بشر، اور اُس کے پیچھے
دوشیزۂ داوری کا ڈُولا ہو گا

قُدرت سے کریگی عقد نسلِ نَوخیز
ہوگا مرے فرزند کا دل زمزمہ ریز
شمس و قمر و نُجوم و عرش و کُرسی
کل میری بہو آئے گی لے کر یہ جہیز

جس روز جوانی ہوئی رُخصت میری
باقی نہ رہی تجھ کو ضُرورت میری
وہ دل پہ ترے، مری جوانی کا تھا عکس
تو جس کو سمجھتی تھی محبّت میری

خورشید میں وہ نورِ رواں ہے کہ نہ پوچھ
ذرّوں میں بھی وہ تابِ جواں ہے کہ نہ پوچھ
نغمے ہی پہ کچھ نہیں مدارِ مستی
ہچکی میں بھی وہ کیفِ نہاں ہے کہ نہ پوچھ

یہ پارۂ نثر، نظم و افسوں ہو گا
یہ قطرۂ لبستہ، سیل و جیحوں ہو گا
افسوس کہ میں نہ ہونگا جب یہ انسان
روحِ گیتی و ربِّ گردوں ہو گا

قدسی سے یہ بہتر تھا کہ انساں ہوتا
آوارہ و وارفتہ و حیراں ہوتا
فرزانۂ صحنِ حرم و دیر اے کاش
دیوانۂ کوئے خوب رویاں ہوتا

ذی فہم غرض سے دل لگاتا ہی نہیں
جوہر کے سوا کچھ اسکو بھاتا ہی نہیں
جو شخص ہے قیس عامری کا طالب
لیلیٰ کی طرف نظر اٹھاتا ہی نہیں

راہی ہیں سوئے حَبش، نگارانِ صبیح
محرابِ ملاحت سے گریزاں ہیں ملیح
مُوسیٰ میں ہُمک رہی ہے روحِ فرعَون
صَرصَر میں بدل رہے ہیں انفاسِ مسیح

جویائے کفن ہے زندگی کا جامہ
عامی نیزہ، بنا ہے عالم خامہ
سُنتا ہوں ہلال کی طرف سے اے جوشؔ
خنجر کو دیا جائے گا دعوت نامہ

کل تھیں جن رہ زنوں کے لب پر آہیں
اب ڈھونڈ رہے ہیں رہ زنی کی راہیں
لوگوں کا خیال ہے کہ دُنیا کے ولی
شیطان کے گلے میں ڈال دیں گے بانہیں

صہبائے عقیدت و مواخات پیئے
سہمی ہوئی سیتا کے گریبان سیئے
لنکا میں مچی ہوئی ہے اک دھوم کہ رام
آنے ہی پہ ہیں بعیت راون کے لئے

وہ دوست بنائے ہیں کہ جی جانتا ہے
محبوب وہ پائے ہیں کہ جی جانتا ہے
سرکارِ جہالت و حماقت کے طفیل
وہ لطف اُٹھائے ہیں کہ جی جانتا ہے

ملتا ہے جب آسماں سے انعامِ بہار
ہوتا ہے زمیں کے دوش پر دامِ بہار
غنچوں پہ ٹپک پڑتے ہیں آنسو میرے
اللہ رِی آگاہئ انجامِ بہار

مانا کہ رواں تھے غم کے دھارے دل پر
اک عمر سے چل رہے تھے آرے دل پہ
پُرسش کو وہ خود آئی ہیں اے حضرتِ جوشؔ
اب تو مرہم لگا تمھارے دل پر؟

اک سمت ادب ہے، ایک جانب مذہب
اِن دونوں میں کون پاک دل ہے یارب؟
عالم۔ باطل بہ قلب و حق بر منبر
شاعر۔ ایماں بہ سینہ و کُفر بہ لب

بیکار ہے جاگنا تو سو جانے دے
پانا نہیں ممکن ہے تو کھو جانے دے
یا دل کی اُمید اے ستمگر بر لا
یا خیر سے مایوس ہی ہو جانے دے

یہ حُسن کی مُورتیں بلا ہوتی ہیں
آتا نہیں کچھ سمجھ میں کیا ہوتی ہیں
جینے کی نکالتی نہیں کوئی سبیل
مرنے کو جو کہئے تو خفا ہوتی ہیں

اس بُرقعِ شب رنگ میں اللہ غنی
قد سروِ سہی، چہرہ عقیقِ یمنی
نیزے پہ ہے عَلَم کا گویا پٹکا
پٹکے سے دمک رہی ہے سونے کی اَنی؟

اَوجِ ظُلمت پہ شمعِ خنداں گویا
زُلفِ جُنباں پہ موجِ افشاں گویا
یہ بُرقعِ شب سواد، یہ رُوئے صَبیح
کعبے پہ گہر فشاں ہے قُرآں گویا

تابش میں رُخِ شمس و قمر سے بہتر
قیمت میں جواہر و گہر سے بہتر
آغوشِ نگار میں جو گزرے اے جوشؔ
وہ نیم نفس، عمرِ خضر سے بہتر

بُرقع یہ سیاہ، اور یہ رُوئے انور
ظُلمت کی جبیں پہ چاندنی کا جھومر
یا تیرہ اُفق پہ تبسمِ صبحِ رنگیں
یا سروِ سیہ کی عین چوٹی پہ قمر

خُوبانِ جہاں کہیں بدی کرتے ہیں؛
خدّامِ کُہن سے بے رُخی کرتے ہیں؛
اے بادِ صبا، اُن کی لٹوں کو چھو کر
کہنا کہ غریبوں سے یہی کرتے ہیں؟

ہر چند کہ بدتر از گدا ہوں اے دوست
بے قدر و مُلول و بے نوا ہوں اے دوست
محرابِ خرابات میں لیکن اس وقت
شاہ قدر و میرِ قضا ہوں اے دوست

اِنساں کو راہ پر لگا دے ساقی
رازِ توحیدِ جاں بتا دے ساقی
اِس عالمِ خاک و آب کو کُلّیّۃً
ہر فرد کا جُزوِ دل بنا دے ساقی

یا دل ہے ترا سیاہ، یا عقل ہے خام
تو یا تو خِرَد نوش ہے، یا خُوں آشام
اِس رُوئے زمیں پہ ہے فقط ایک ہی قوم
اے مُوجدِ اصطلاحِ "بین الاقوام"

سینے میں محبّت کا اُجالا کر لے
آفاق کا دل میں درد پیدا کر لے
اِس بستۂ "انا" کو اذنِ وسعت دے کر
اُٹھ، عرصۂ گیتی کا احاطہ کر لے

اے کاش، انسان مہر پرور بن جائے
یہ پارۂ سنگ، رشکِ گوہر بن جائے
یہ قطرۂ حُبِّ ذات اِتنا پھیلے
آفاق در آغوش سمندر بن جائے

اس درد کا ممکن نہیں دُنیا میں جواب
زہرہ ہوتا ہے سنگ و آہن کا بھی آب
خود موت کا دل تجھ سے لرز اُٹھتا ہے
اے خستگیٔ شباب و مرگِ احباب

حیوان کو آ، بشر بنا دے ساقی
ذرّات کو، اُٹھ، گہر بنا دے ساقی
ہر جام میں بادۂ اخوّت بھر کر
انساں کو شریف تر بنا دے ساقی

ہاں، آ حرکت میں، نہ جھجک، میں قرباں
یہ رُت نہ رہے گی دیر تک، میں قرباں
موجیں، شاخیں، گھٹائیں، سب رقص میں ہیں
جلدی سے زرت کرکے تھرک، میں قرباں

بہتا ہے ہمیشہ خون سنسنچ کا، ہمراز
ہر سانس ہے دل پر ایک دھچکا، ہمراز
جھومی وہ شاخ نرم سنکی وہ نسیم
لچکا، لچکا، کمر کو لچکا، ہمراز

اِس آن کو جُزوِ دل بنا لے کمبخت
جلوؤں کا ارے لُطف اُٹھا لے کمبخت
کیا جانئے پھر غُرفہ کھُلے یا نہ کھُلے
کیا دیکھ رہا ہے، مُسکرا لے کمبخت

یہ خیمہ، یہ رات، یہ سماں، یہ احباب
مسند پہ یہ ہنگامۂ صد حُسن و شباب
اے ساقیٔ دل نواز و اے مُطربِ شوخ
طبلے پہ پڑے تھاپ، چلے دَورِ شراب

یہ نغمۂ دل نشیں ترے ساز میں ہے
رقصاں ہو کہ تو انجمنِ ناز میں ہے
اس وقت کا رس نچوڑ لے جی بھر کے
ہر لمحہ ترا عرضِ پرواز میں ہے

کیوں چاک کیا؟ اب بھی گریباں سی لے
کیوں بندۂ تشنگی ہے؟ پی لے، پی لے
اک آن نہ کر آہ و فغاں میں برباد
بدبخت، وہ موت آ رہی ہے، جی لے

ہاں فرصتِ زندگی نہیت کم ہے
باوصفِ کمی، ہر اک قدم پر خم ہے
مل جائے اگر طرب کا کوئی لمحہ
اُس لمحے کو کھینچ جتنا اُس میں دم ہے

یہ وقتِ خوشی ہے، کر نہ غفلت اِس سے
دھو لے سینے کی ہر جراحت اس سے
یہ جو اک آن کی ملی ہے مُہلت
ہاں کھینچ لے اک صدی کی دولت اس سے

اے دشمنِ بے پناہ، کب ہو گا غروب
اے سنگِ رہِ گناہ، کب ہو گا غروب

پیاسے بیٹھے ہیں کب سے رندانِ کرام
اے شعلۂ روسیاہ، کب ہو گا غروب

مُردہ انساں سے زندہ حیواں بہتر
یزدانِ خُنک سے گرم شیطاں بہتر

سُن مردِ گرہ جبیں کہ رندِ عاقل
کج خُلق پری سے دیو خنداں بہتر

غُنچے، تری زندگی پہ دل ہلتا ہے
بس ایک تبسُّم کے لئے کِھلتا ہے
غُنچے نے کہا کہ اِس چمن میں بابا
یہ ایک تبسُّم بھی کسے ملتا ہے

گلشن سے بصد رنج و تعب جاتی ہوُں
صد حیف کہ ہنگامِ طرب جاتی ہوُں
پھُوٹی جو کرن تو گُل نے پُوچھا کیا ہے؟
شبنم نے کہا سلام، اب جاتی ہوُں

نوبت کی صداؤں سے سرِ راہ گذر
اللہ ری تازگیٔ رُوئے انور
شہنائی کی تان بڑھ رہی ہے جتنی
اُتنی ہی مِٹھاس اُتر رہی ہے مُنہ پر

مشرق نے شگفتگی کے در کھول دیئے
گُل زار نے کیسہ ہائے زر کھول دیئے
گُل مہکے، ہوا چلی، شگوفے چٹکے
طاؤسِ فلک نے اپنے پر کھول دیئے

افسوس ہے اے عربدۂ چرخِ کبود
ہو، اور ایازیت کا دشمن، محمود
کہتے ہیں کہ یہ خلیلِ عصرِ حاضر
وا کر کے رہیگا بابِ نارِ نمرود

صد حیف کہ دوشِ جنگ پر ہے برہم
زلفِ متولیانِ امنِ عالم
یعنی طوفانِ بے اماں کا ابکی
خود کشتیٔ نوح میں کھلے گا پرچم

شاہینِ جہاں کے پَر کترنے والے
گرداب کو توڑ کر اُبھرنے والے
یہ جن کے رُخوں پہ ناخدائی کی ہے لہر
کشتی کو یہی ہیں غرق کرنے والے

شاعر ہیں مگر رُوحِ سخن سے ہیں دُور
ہیں آب سے شاد، آتشِ تر سے رنجُور
کیفی[1] بیٹھے ہیں مے کشوں میں بے کیف
برعکس نہند نامِ زنگی کافُور

[1] کیفی اعظمی

پانی اور کال

برسوں سے برس رہا ہے پانی
جھم جھام، جھما، جھما جھما جھم
برسوں سے برس رہا ہے پانی

(۱)

پھر بھی ہے مری زمین پیاسی
ہر باغ پہ چھائی ہے اُداسی
ہر گُل کا ہے رنگ ارغوانی
برسوں سے برس رہا ہے پانی

جھَم جھام، جھَما، جھَما، جھما جھم
برسوں سے برس رہا ہے پانی

(۲)

آکاش پہ گا رہے ہیں بادل
پُروائی کی بج رہی ہے چھاگل
مہنگائی وُہی، وُہی گرانی
برسوں سے برس رہا ہے پانی
جھم جھام، جھما، جھما، جھما جھم
برسوں سے برس رہا ہے پانی

(۳)

وہ کال پہ کال پڑ رہے ہیں

بھوکے مر مر کے سڑ رہے ہیں

جھونکوں میں ہے موت کی کہانی

برسوں سے برس رہا ہے پانی

جھم جھام، جھما، جھما، جھما جھم

برسوں سے برس رہا ہے پانی

(۴)

سنسان ہیں تن نگر کی گلیاں

مُرجھائی پڑی ہیں من کی کلیاں

دم توڑ رہی ہے زندگانی

برسوں سے برس رہا ہے پانی

جھم، جھام، جھما، جھما، جھما جھم

برسوں سے برس رہا ہے پانی

(۵)

ہر ابر کی چھاؤں میں جلاپا

ہر سائے میں رینگتا بڑھاپا

ہر موڑ پہ اونگھتی جوانی

برسوں سے برس رہا ہے پانی

جھم جھام، جھما، جھما، جھما جھم

برسوں سے برس رہا ہے پانی

(۶)

ہر رُخ ہے مرقّع غلامی
ہر لب ہے گواہ تشنہ کامی
ہر آنکھ ہے مُہرِ ناتوانی
برسوں سے برس رہا ہے پانی
جھم، جھام، جھما جھما، جھما جھم
برسوں سے برس رہا ہے پانی

تنہائی

اے دل، کس سے بات کروں؟

(۱)

یاں کوئی دم ساز نہیں
پہچانی آواز نہیں
سوز نہیں ہے ساز نہیں
کیونکر دن کو رات کروں
اے دل کس سے بات کروں؟

(۲)

کب تک پُوچھوں اِس غم کو
کب تک ڈھونڈوں ہمدم کو
کب تک یوں ہر موسم کو
رو رو کے برسات کروں
اے دل کس سے بات کروں

(۳)

خود ہی تجھ کو بہلاؤں
بچکانے گیت سُناؤں
بھولا بن کر پھُسلاؤں

پھر تجھ سے ہی گھات کروں
اے دل کس سے بات کروں

(۴)

گوٹیں لے بس کر حسرت میں
پہروں کھیلوں فرصت میں
خود سے جیتوں خلوت میں
پھر خود ہی کو مات کروں
اے دل کس سے بات کروں

مُرلی

یہ کن نے بجائی مُرلیا

ہردے میں بدری چھائی

(۱)

گوکُل بن میں برسا رنگ

باجا ہر گھٹ میں مردنگ

خود سے کھلا ہر اک جوڑا

ہر اک گوپی مسکائی

یہ کن نے بجائی مُرلیا

ہردے میں بدری چھائی

(۲)

گنگا جل کے ہلکورے

بن گئے نینوں کے ڈورے

کلیاں چٹکیں گُلشن میں

تاروں نے لی انگڑائی

یہ کس نے بجائی مُرلیا

ہردے میں بدری چھائی

(۳)

چھکلے پھیلے نرناری

سب مل مل باری باری

چھلکیں پنگھٹ پہ گگریاں

ارجُن نے دَھنک لچکائی

یہ کن نے بجائی مُرلیا

ہردے میں بدَری چھائی

سوتا ہے بھگوان

کیا سوتا ہے بھگوان ؟

(۱)

دَھرتی ہالے ڈولے
جھٹکے اور ہچکولے
پتّھر ہو گئے پولے
کیونکر نہ اُڑیں اَوسان
کیا سوتا ہے بھگوان ؟

کیا سوتا ہے بھگوان؟

(۲)

گرتی دیواروں نے
جلتے انگاروں نے
چلتی تلواروں نے
کر ڈالا ہے ہلکان
کیا سوتا ہے بھگوان؟

(۳)

جو نگری تھی آباد
لاج بھری اور آزاد

ہر دل تھا جس میں شاد

وہ نگری ہے ویران

کیا سوتا ہے بھگوان

(۴)

گھس آیا گھر میں چور

کب ہووےگی اب بھور

ایسا ہے پون کا زور

جیسے ارجن کے بان

کیا سوتا ہے بھگوان

دعوتِ سیر

جنگل میں ہے رنگ
چل بھی مُورے سنگ

(۱)

جنگل ہے گُلزار
یا اک سُندر نار
چولی جس کی تنگ
جنگل میں ہے رنگ
چل بھی مورے سنگ
گوری چل بھی مورے سنگ

جنگل میں ہے رنگ

(۲)

ہر پتّے میں پیت
ہر جھونکا اِک گیت
ہر ندّی مِردنگ
جنگل میں ہے رنگ
چل بھی مورے سنگ
گوری چل بھی مورے سنگ

(۳)

جنگل میں ہے رنگ

ہلکی ہلکی دُھوپ
دُھوپ کے اندر رُوپ
رُوپ کے اندر رنگ
چل بھی مورے سنگ
جنگل میں ہے رنگ
گوری چل بھی مورے سنگ

تو اگر سیر کو نکلے

(الف)

تو اگر سیر کو نکلے تو اُجالا ہو جائے

(۱)

سُرمئی شال کا ڈالے ہوئے ماتھے پہ سرا
بال کھولے ہُوئے، صندل کا لگائے ٹیکا
یُوں جو ہنستی ہوئی تو صُبح کو آ جائے ذرا
باغِ کشمیر کے پھولوں کو اچنبھا ہو جائے
تو اگر سیر کو نکلے تو اُجالا ہو جائے

تو اگر سیر کو نکلے تو اُجالا ہو جائے

(۲)

لے کے انگڑائی جو تُو گھاٹ پہ بدلے پہلو
چلتا پھرتا نظر آجائے ندی پر جادو
جُھک کے مُنھ اپنا جو گنگا میں ذرا دیکھ لے تو
نِتھر کر پانی کا مزا اور بھی میٹھا ہو جائے
تو اگر سیر کو نِکلے تو اُجالا ہو جائے

(۳)

صُبح کے رنگ نے بخشا ہے وہ مکھڑا تجھکو
شام کی چھاؤں نے سونپا ہے وہ جُوڑا تجھکو

کہ کبھی پاس سے دیکھے جو ہمالا تجھ کو

اِس ترے قَد کی قسم، اور بھی اُونچا ہو جائے

تو اگر سیر کو نکلے تو اُجالا ہو جائے

(ب)

تو گھر سے نکل آئے تو دھرتی کو جگا دے

(۱)

تُو باغ میں جب وقت لچکتی ہوئی آئے
ساون کی طرح جھوم کے پودوں کو جُھمائے
جُوڑے کی گرہ کھول کے بیلا جو اُٹھائے
پربت پہ برستی ہوئی برکھا کو نچا دے
تو گھر سے نکل آئے تو دھرتی کو جگا دے

(۲)

آنکھوں کو جھکائے ہوئے، پلّو کو اُٹھائے
مُکھڑے پہ لئے صُبح کے مچلے ہوئے سائے
لیتی ہوئی انگڑائی اگر گھاٹ پہ آئے
گنگا کی ہر اک لہر میں اک دُھوم مچا دے
تو گھر سے نکل آئے تو دھرتی کو جگا دے

(۳)

کرنوں سے گرے اوس جو ہو تیرا اشارا
مٹی کو نچوڑے تو بہے رنگ کا دھارا

ذرّے کو جو رَوندے تو بنے صُبح کا تارا

کانٹے پہ جو تو پاؤں دَھرے پھُول بنا دے

تو گھر سے نکل آئے تو دَھرتی کو جگا دے

ناجانے کون؟

مَن مندر میں آتا ہے ——— ناجانے کون؟

(۱)

جب ہوتی ہے بھور

گاتے ہیں جب مور

تو مَن میں جوں چور

چُپکے چُپکے آتا ہے ——— ناجانے کون؟

مَن مندر میں آتا ہے ——— ناجانے کون؟

من مندر میں آتا ہے — نا جانے کون؟

(۲)

بڑھتے ہیں جب سائے
تاروں کو چھٹکائے
تو ہرڈے میں ہائے
چٹکی سی لے جاتا ہے — نا جانے کون؟
مَن مندر میں آتا ہے — نا جانے کون؟

(۳)

جب ہوتی ہے رات
گاتی ہے برسات

جی کرتا ہے بات

تب دل میں مُسکاتا ہے — نا جانے کون؟
مَن مندر میں آتا ہے — نا جانے کون؟

دلیری

میں دِھیرے دھیرے کیوں بولوں

(١)

تھر تھر کیوں کانپوں؟
کیوں اپنا منھ ڈھانپوں؟
کیوں نا گھونگٹ کے پٹ کھولوں ؟
میں دھیرے دھیرے کیوں بولوں

(٢)

ہاں موری ہو گی جیت

کچھ چوری ہے کیا پیت؟
کیوں نا بڑھ کے موتی رولوں؟
میں دھیرے دھیرے کیوں بولوں؟

(۳)

مِلتا ہے کس کو چین؟
جگنا تو ہے دن رَین
کیوں نا پی سے مل کے سولوں؟
میں دھیرے دھیرے کیوں بولوں؟

---

(۱)

اک پھول کھلا تھا جنگل میں

اس پھول کا اک رکھوالی تھا — رکھوالی تھا اور مالی تھا

اب پھول کی سوکھی ڈالی ہے — اور جیل کے اندر مالی ہے

سب کہتے ہیں مالی خونی ہے — وہ خونی ہے باتونی ہے

یہ سچ ہے وہ باتونی ہے — پر جھوٹ ہے یہ وہ خونی ہے

اک پھول کھلا تھا جنگل میں

اس پھول کا اک رکھوالی تھا　　رکھوالی تھا اور مالی تھا

---

(۲)

وہ پھول ہے اب مرجھایا سا　　مرجھایا سا کمھلایا سا

اب پانی دے گا کون اُسے　　جو لانی دے گا کون اُسے

رکھوالی ہے زنجیروں میں　　اب مالی ہے زنجیروں میں

اک پھول کھلا تھا جنگل میں

اس پھول کا اک رکھوالی تھا　　رکھوالی تھا اور مالی تھا

---

(۳)

زنجیروں میں اب مالی ہے　　اب پھول ہے اور پامالی ہے

سکتے میں ڈالی ہے اور باغ کا سینہ خالی ہے

اک پھول کھلا تھا جنگل میں

اس پھول کا اک رکھوالی تھا رکھوالی تھا اور مالی تھا

اک پھول کھلا تھا جنگل میں

Best song

فلم "من کی جیت"

(۱)

نگری مری کب تک یونہی برباد رہیگی
دُنیا یہی دُنیا ہے تو کیا یاد رہیگی

آکاش پہ نکھرا ہوا سورج کا ہے مُکھڑا
اور دھرتی پہ اُترے ہوئے چہروں کا ہی دُکھڑا
دُنیا یہی دُنیا ہے تو کیا یاد رہے گی
نگری مری کب تک یونہی برباد رہے گی

کب ہو گا سویرا؟ کوئی اے کاش بتا دے

کس وقت تک اے گھومتے آکاش بتا دے

انسان پر انسان کی بیداد رہے گی

نگری مری کب تک یونہی برباد رہے گی

چہکار سے چڑیوں کی چمن گونج رہا ہے

جھرنوں کے مدھر راگ سے بَن گونج رہا ہے

پر میرا تو فریاد سے مَن گونج رہا ہے

کب تک میری ہونٹوں پہ یہ فریاد رہیگی

نگری مری کب تک یونہی برباد رہیگی

(۲)

نگری مری برباد ہے برباد ہے برباد

برباد ہے برباد

عشرت کا اِدھر نور، اُدھر غم کا اندھیرا

ساغر کا اِدھر دور اُدھر خشک زباں ہے

آفت کا یہ منظر ہے قیامت کا سماں ہے

آواز دو انصاف کو انصاف کہاں ہے

راگوں کی کہیں گونج کہیں نالۂ و فریاد

نگری مری برباد ہے برباد ہے برباد

برباد ہے برباد

ہر شے میں چمکتے ہیں اِدھر لاکھ ستارے

ہر آنکھ سے بہتے ہیں اُدھر خون کے دھارے

ہنستے ہیں چمکتے ہیں اِدھر راج دُلارے

روتے ہیں بلکتے ہیں اُدھر درد کے مارے

اک بھوک سے آزاد تو سو بھوک سے ناشاد

نگری مری برباد ہے برباد ہے برباد

برباد ہے برباد

نگری مری کب تک یونہی برباد رہے گی

دنیا یہی دنیا ہے تو کیا یاد رہے گی

اے چاند امیدوں کو مری شمع دکھا دے

ڈوبے ہوئے کھوئے ہوئے سورج کا پتا دے

روتے ہوئے جُگ بیت گیا اب تو ہنسا دے

اے میرے ہمالہ مجھے یہ بات بتا دے

ہو گی مری نگری بھی کبھی خیر سے آزاد

نگری مری برباد ہے برباد ہے برباد

برباد ہے برباد

نگری مری کب تک یونہی برباد رہے گی

دنیا یہی دنیا ہے تو کیا یاد رہے گی

وہ آ رہا ہے ساقی ہنستا نیا زمانہ
ساقی نیا زمانہ ساقی نیا زمانہ
ہاں دیکھ تو زمیں سے چنگاریاں وہ اٹھّیں
اٹھکر وہ آسماں کی جانب ہوئیں روانہ
وہ آ رہا ہے ساقی ہنستا نیا زمانہ
ساقی نیا زمانہ ساقی نیا زمانہ

وہ دیکھ آرہی ہے وہ صبح دندناتی
کوئی نہ چل سکے گا اب رات کا بہانہ
وہ آرہا ہے ساقی ہنستا نیا زمانہ
ساقی نیا زمانہ ساقی نیا زمانہ

اب وقت آگیا ہے سبزے پہ نصب کردے
شبنم کی چاندنی میں پھولوں کا شامیانہ
وہ آرہا ہے ساقی ہنستا نیا زمانہ
ساقی نیا زمانہ ساقی نیا زمانہ

سانپوں کے کچلنے کی قسم کھائی ہے جس نے

دنیا کے بدلنے کی قسم کھائی ہے جس نے

ان پاپ کے محلوں کو گرا دونگا میں اک دن

ان ناچ کے رسیوں کو نچادوں گا میں اک دن

مٹ جائیں گے انسان کی صورت کے یہ حیوان

بھونچال ہوں بھونچال ہوں طوفان ہوں طوفان

طوفان ہوں طوفان

تڑپوں گا تو ہر چادر زر چاک کروں گا

بھڑکوں گا تو ہر لاکھ کا گھر خاک کروں گا

کڑکوں گا تو ہر بیر کے اُڑ جائیں گے اوسان

بھونچال ہوں بھونچال ہوں طوفان ہوں طوفان

طوفان ہوں طوفان

سانپوں کے کچلنے کی قسم کھائی ہے جس نے

دنیا کو بدلنے کی قسم کھائی ہے جس نے

طوفان ہوں طوفان

سانپوں کے کچلنے کی قسم کھائی ہے جس نے
دنیا کے بدلنے کی قسم کھائی ہے جس نے

بگڑے ہوئے سنسار کے ڈھانچے کو ہلا کر
لیجاؤں گا بپھرے ہوئے دھاروں میں بہا کر
اُبھریں گے نئی شان سے ڈوبے ہوئے انسان
بھونچال ہوں بھونچال ہوں طوفان ہوں طوفان
طوفان ہوں طوفان
سانپوں کے کچلنے کی قسم کھائی ہے جس نے
دنیا کے بدلنے کی قسم کھائی ہے جس نے

آگ لگا دیں آگ

آؤ اس پاپی دنیا میں آگ لگا دیں آگ

آنکھوں والے سیس نوائیں اندھے ہوں سردار

کوئل سے نذرانہ مانگے کوّے کا دربار

ایک طرف رہیں موٹے تازے ایک طرف بیمار

اِن کے گلے میں گوری باہیں اُن کے گلے میں ناگ

آگ لگا دیں آگ

کُتّا سوئے گدّی پر اور ٹہلے چوکیدار

آدم کا بانکا بیٹا اور بھڑوے کا بیوپار

ایک طرف ہیں دھن والے اور ایک طرف نادار

اُن کے منہ میں شکّر ہے اور اِن کے منہ میں جھاگ

آگ لگا دیں آگ

آؤ اس پاپی دنیا میں آگ لگا دیں آگ

مطبوعہ یونائیٹڈ فائن آرٹ لیتھو گرافرس بجگاڈل بمبی ۱۰